اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

مارچ ۲۰۱۷ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

دسمبر

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان لاہور

جلد ۲۱، شمارہ ۳، مارچ ۲۰۱۷ء/ جمادی الثانی ۱۴۳۸ھ

مشمولات

○شذرات

- یہ اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے؟ ۴
- یہ دہشت گردی نہیں رُک سکتی — مدیر — ۵

○تعلیم و تبیت

- مسلم برصغیر کی دینی تعلیم کی تاریخ: مختصر جائزہ — ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ — ۶
- عصری نصابِ تعلیم کی مقاصدِ تعلیم سے دوری — سید خالد جامعی — ۱۵

○میڈیا

ٹرمپ، بلاگرز اور کشمیر — پروفیسر عاصم حفیظ — ۲۶

○علوم القرآن

مبہمات القرآن — مولانا عبدالحمید المری — ۲۸

○فہم دین

- اقامتِ دین کا صحیح تصور — ڈاکٹر محمد امین — ۳۴

○غلبہ دین

- غلبۂ دین کے تقاضے — محمد مشتاق ربانی — ۳۹
- پاکستان کا مخدوش اسلامی مستقبل — ادارہ — ۴۳

○اسلام اور مغرب

- مغربی جمہوریت: متبادل کیا ہے؟ — مدیر — ۴۴
- مغرب کا ایجاد کردہ نیا مذہب: مذہبِ انسانیت ڈاکٹر طاہر مسعود صاحب کی خدمت میں — معراج محمد — ۵۲

○تبصرہ کتب

- عبدالرشید ارشد: ایک مطالعہ — مدیر — ۵۸
- جناب غلام احمد پرویز کی فکر کا علمی جائزہ — ۵۸

فکر و نظر

یہ اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے؟

جی ہاں! یہ مملکتِ خدا داد اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے جس کا دستور اور قوانین بڑی حد تک اسلامی ہیں لیکن یہاں مسلمانوں جیسا نام رکھنے والے بلا گرز کو خدا، رسول اور قرآن کی توہین کرنے اور کروڑوں مسلمانوں کی دل آزاری کرنے کی کھلی چھٹی ہے۔ اس مملکت خداداد کی اور اس نظریہ کی جس کی اساس پر یہ مملکت وجود میں آئی، یہ بلاگرز دھجیاں اڑاتے رہیں لیکن انہیں کوئی نہیں پوچھتا۔ ہاں! اگر وہ اس کے منصب داروں (وزیر اعظم، چیف جسٹس، آرمی چیف وغیرہ) کی توہین کریں تو پھر چند دن کے لیے پکڑ کر ان کی گوشمالی کی جاتی ہے اور پھر ان کو رہا کر دیا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ کیسا لبرل ازم ہے؟ یہ کیسی مادر پدر آزادی ہے؟ اور اس مادر پدآزادی کا منبع کیا ہے؟ ہمارا دین، قرآن وسنت اور فقہ، ہماری روایات، ہماری اقدار، ہمارا دستور اور ہمارے قوانین کوئی بھی اس مادر پدر آزادی کی اجازت نہیں دیتا۔ تو یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ کیسے ہو رہا ہے؟ کون کر رہا ہے؟ کون کرا رہا ہے؟ کس قانون کے تحت اس کی اجازت دی جا رہی ہے؟ کیا 295C غازی ممتاز قادریؒ کے ساتھ ہی دفن کر دی گئی تھی؟

سوال یہ بھی ہے کہ بیس کروڑ کے اس مسلم ملک کی دینی قوتیں اور محب اسلام عوام کہاں سوئے ہوئے ہیں؟ اسلامی انقلاب اور نفاذ شریعت کا نعرہ لگانے والی دینی سیاسی جماعتیں، کروڑوں کے مجمع لگانے والی اصلاحی تحریکیں، قال اللہ وقال الرسول کی صدائیں بلند کرتے ہزاروں عظیم الشان دینی مدارس اور اللہ اکبر کی صداؤں سے گونجنے والی لاکھوں مساجد کے ائمہ اور خطیب حضرات.... یہ سب کہاں سوئے ہوئے ہیں؟ کیا خدا، رسول اور قرآن کی توہین سے بڑھ کر بھی کوئی مسئلہ، حادثہ اور المیہ ہو سکتا ہے؟

دین پسند عوام، رسول کے نام پر کٹ مرنے والے اور اس کا نام سن کر ہاتھ چومنے اور آنکھوں کو لگانے والے عوام کہاں ہیں؟ کدھر سوئے ہوئے ہیں؟

سوال یہ بھی ہے کہ اس ملک کے حکمران اور اشرافیہ پاکستان کو کس طرح کا ملک بنانا چاہتے

ہیں؟ اور کیوں؟ اس مادر پدر آزادی کا محرک کیا ہے؟ اس کا منبع کیا ہے؟ اس کے پیچھے کون ہے؟

ہم مطالبہ کرتے ہیں دینی سیاسی جماعتوں سے، اصلاحی تحریکوں سے، ہزاروں دینی مدارس کے علماء اور لاکھوں مسجدوں کے ائمہ اور خطباء سے، خدا کا خوف رکھنے والے وکلاء سے اور اللہ ورسول کی محبت کا دم بھرنے والے مسلمان عوام سے کہ وہ اٹھیں اور ہر شہر اور ہر قصبے سے کم از کم پچاس ایف آئی آر ان بلاگرز کے خلاف درج کرائیں اور چیئرمین پیمرا، وزیر اطلاعات، وزیر داخلہ اور وزیر اعظم کو بھی فریق بنائیں۔

اگر ربّ ذوالجلال، اس کی مقدس کتاب اور اس کے محبوب پیغمبر کی توہین پر بھی ہمارے دینی اور عوامی حلقوں کا دل نہیں تڑپتا اور وہ اپنی بے حسی کے خول سے باہر نہیں آتے تو پھر وہ سوچیں کہ ان کا اسلام کیسا اسلام ہے؟ وہ کیسے مسلمان ہیں؟ وہ کل قیامت کو اللہ کے حضور کیا جواب دیں گے؟ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو کیا منہ دکھائیں گے؟ اور وہ یہ بھی سوچیں کہ پھر اس معاشرے کا اور اس ملک کا اسلامی مستقبل کیا ہے بلکہ مستقبل ہی کیا ہے؟

یہ دہشت گردی نہیں رُک سکتی

ملک میں دہشت گردی کی تازہ لہر نے پاکستانی عوام کو پھر پریشان کر دیا ہے اور حکومتی وعسکری حلقوں کی کامیابی کے نعرے بھی مشکوک لگنے لگے ہیں۔ ہم پہلے بھی اس موضوع پر کئی دفعہ لکھ چکے ہیں اور ہماری یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ یہ دہشت گردی اس وقت تک نہیں رُک سکتی جب تک ہماری سیاسی اور عسکری قیادت اپنے نظریے سے جڑ کر اور بیس کروڑ عوام کو پشت پناہ بناتے ہوئے اور مغرب کی فکری غلامی اور مرعوبیت سے نکل کر یہ دہشت گردی کرانے والے امریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ نہیں کہتی کہ اب بس ورنہ....

اور اِس وقت ہماری جو قیادت ہے چونکہ وہ یہ کام نہیں کر سکتی اور اصل دشمن کو دشمن سمجھ کر اس کے خلاف مناسب رویہ اختیار نہیں کر سکتی تو امریکہ اور اس کے حواریوں اور ایجنٹوں کے لگائے زخم تو ہمیں چاٹنے ہی پڑیں گے۔

تعلیم و تربیت　　　　ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ

مسلم برصغیر کی دینی تعلیم کی تاریخ: مختصر جائزہ
اور دینی تعلیم کی موجودہ صورتِ حال (۲)

تاہم اگر ہم اس منفی پہلو کو نظر انداز کر دیں اور متن سازی کے رجحان پر نظر رکھیں تو ہمیں بہت دل چسپ اور حیرت انگیز مثالیں مل جائیں گی۔ میرے پاس اس وقت کوئی کتاب تو نہیں ہے تاہم مجھے ایک عالم کے تیار کردہ ایک متن کا علم ہے جو ایک مضمون کا رواں دواں متن تھا۔ پھر اس نے یہ کیا کہ اس نے متن کی نص کو کئی کالموں میں تقسیم کیا کہ اگر متن کالموں کے مطابق افقی اعتبار سے تقسیم کیا جائے تو یہ ایک علاحدہ مضمون کا ایک مختلف متن ہوا۔ اگر پیراگراف کو کالموں کی ترتیب سے دیکھا جائے تو پہلا، دوسرا، تیسرا، چوتھا کالم الگ الگ متون کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ایک ہی صفحے پر سات متن ہوتے جو باہم دگر ملے ہوتے تھے اور صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ ایک متن میں تین مختلف زبانیں موجود ہوتی تھیں۔ رواں متن عربی میں ہے۔ اگر آپ مثلاً کالم ایک کو دیکھیں تو یہ فارسی میں ہے دوسرا ترکی میں۔ یہ شعبدہ بازی (اگر تعبیر کی اجازت دی جائے) مصنف کے ذہن رسا کی عکاس، فکر گردوں سیر کی غماز اور زبان پر فاضلانہ قدرت کا منہ بولتا اظہار ہے، لیکن اس نے بحیثیت مجموعی علم کے پھیلاؤ اور مختلف تخصصات کے نشوو ارتقا میں کم ہی کوئی کردار ادا کیا ہے۔ یہ صورتِ حال عہدِ سلاطین کے اختتام اور ہندوؤں اور پھر مغلوں کے ہاتھوں خاندانِ لودھی کے زوال تک جاری رہی۔

جب مغل ہندوستان آئے اور ہمایوں کے بعد اپنے آپ کو مستحکم کیا، تو برصغیر میں ایک اور روایت متعارف ہوئی۔ یہ روایت فلسفے اور منطق کی تھی جس کی ساخت پرداخت اور تانا بانا ایران میں تیار ہوا۔ اب برصغیر اور مدارس کے علمی روابط ایران کے ساتھ استوار ہوئے، اور ایرانی علما بڑی تعداد میں بلائے گئے۔ سیکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں اہل علم و ادب یہاں آئے۔ شاعر، فلسفی، منطق اور دیگر علوم کے ماہرین نے ہندوستان آ کر مدارس کے نصاب میں فلسفے اور معقولات یا عقلی علوم کو متعارف کروایا۔ اب اور اس کے بعد کے دور میں مدرسہ دو مختلف روایات کا امین بن

گیا: وسط ایشیا اور افغانستان کی روایت جو متن، مختصر متن اور متن پر متن کے ذریعے فقہ اور اصول فقہ پر زور دیتی ہے اور دوسری روایت ایرانی ہے جس میں زور فلسفے اور منطق پر تھا۔ عہدِ مغلیہ میں مدرسے کا یہ بنیادی خاکہ ہے۔

ہندوستان کے مختلف شہروں میں کئی روایات قائم تھیں، جن میں سے دو خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ایک روایت لکھنؤ میں ایک ادارے فرنگی محل میں پروان چڑھی۔ فرنگی محل دراصل ایک عمارت کا نام ہے جسے جہانگیر نے برطانوی تاجروں کے ایک گروہ کے لیے مختص کیا تھا، جنہیں ہندوستان میں کاروبار اور تجارت کی اجازت دی گئی تھی۔ ان کا دفتر وہیں تھا اور اس کے ذریعے وہ اپنی سرگرمیاں سرانجام دیتے تھے۔

اورنگ زیب عالم گیر کے دور میں جب ان سے متعلق شکایات ملیں کہ وہ جہانگیر کی طرف سے دی گئی ہدایات کی پابندی نہیں کرتے تو اورنگ زیب نے ان کے خلاف انتظامی کارروائی کی، اور ان سے وہ عمارت چھین کر انہیں اس سے بے دخل کر دیا۔ اس کے بعد یہ عمارت مسلمان علماء کی ایک جماعت کو دی گئی جس میں انہوں نے ایک مدرسہ قائم کر دیا۔ چونکہ یہ عمارت ''فرنگیوں'' کی ملکیت میں تھی، اس لیے یہ ''فرنگی محل'' (قصر مغربیاں) کے نام سے معروف ہوئی۔ یہ مدرسہ بھی مدرسہ فرنگی محل (فرنگیوں کے محل یا قلعے میں قائم کردہ مدرسہ) کے نام سے معروف ہوا۔ یہ مدرسہ، اورنگ زیب عالم گیر کے حکم سے معاصر فقیہ اور عالم مولانا نظام الدین سہالوی نے قائم کیا تھا، جنہوں نے عالم گیر کے حکم سے فتاویٰ عالم گیری مرتب کرنے والی دو سو علما کی کمیٹی کی نگرانی بھی کی تھی۔

آپ کو مدرسہ قائم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی جسے آپ نے قائم کیا، جس نے فقہ اور اصول کو بنیادی اہمت دیتے ہوئے برصغیر کی علمی روایت پر غیر معمولی اثر مرتب کیا۔ فقہ اہل اسلام کا ایک زندہ قانون ہے جو اسلامی شریعت کی حرکی روایت کا امین ہے۔ اس میں ہر زمان ومکاں کے لیے رہنمائی اور نمو پذیری کی صلاحیت موجود ہے۔ یہ شریعت وہ رہنمائی قانون اور نظام ہے جس نے مسلمانوں کو ہمیشہ بھرپور رہنمائی کی اور ان کو تاریخ کے ہر دور میں کسی بھی چیلنج سے نمٹنے کے قابل بنایا۔

تاہم بدقسمتی سے مدرسے کی یہ تعلیمی شریعت وہ چیز نہ تھی جو زندہ اور متحرک اسلامی روایت سے عبارت ہے۔ یہ بس ان متون تک محدود تھی جو ہندوستان سے باہر کہیں (وسط ایشیا یا عرب دنیا میں) تیار کیے گئے اور جن سے مصنفین کے پیش نظر مختصر نویسی کی مہارتوں کا زیادہ سے زیادہ اظہار ہوتا تھا، جو جس قدر زیادہ اختصار میں ماہر اور مشکل پسند ہوتا، اسی قدر زیادہ مشہور اور ممتاز ہوتا۔ یہ متون مدرسہ فرنگی محل میں پڑھائے جاتے تھے۔ طلبہ سے مطلوب ان متون کو زبانی یاد کرنا اور مصنف وشارح کے طرزِ اطناب اور لفاظی پر توجہ مرکوز کرنا تھا۔ قواعد زبان، فقہ اور اصول فقہ اسی طرز پر پڑھائے جاتے تھے۔

اصولِ فقہ کو تفقہ اور نئے اصولِ قانون وضع کرنے کے وسیلے کے طور پر پڑھانے کی بجائے الفاظ کی بازی گری کے طور پر پڑھایا جاتا تھا، جس کا ارتکاز کسی مصنف کے متن پر ہوتا تھا۔ یہی حال فقہ کا تھا اس لیے ہماری ناچیز رائے میں مدرسہ فرنگی محل کے عظیم کردار کے باوجود فقہ اور اصولِ فقہ کے میدان میں اس کا اثر بے حد محدود تھا۔ اس عمل کے ذریعے کوئی نئی کتاب تصنیف نہیں کی گئی، اگر کچھ نئی کتابیں تھیں بھی تو ان میں کوئی نیا خیال پیش نہیں کیا گیا، نہ اس میں اصولِ فقہ کی وسیع میدان کا کوئی حصہ نیا شامل کیا گیا۔ کم از کم مدرسہ فرنگی محل کی یہ صورتِ حال مغلیہ سلطنت کے سقوط تک جاری رہی۔

دوسری روایت جون پور کی تھی جو جنوبی ہندوستان، جنوبی یو پی میں قائم تھی۔ اس کو شیرازِ ہند کہا جاتا تھا۔ شیراز کی علمی روایت کا ارتکاز زیادہ تر فلسفے پر تھا، جس کو معقولات یا عقلی علوم کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ شیرازِ ہند، جون پور نے بعض بڑے جلیل القدر علماء پیدا کیے، لیکن ان کی دلچسپی کی تگ وتاز کی جولاں گاہ، ایران سے درآمد شدہ یا ایرانی علماء کے پروردہ عقلی علوم تھے۔ جون پور کی تاریخ میں ملا محمود جون پوری سب سے نمایاں شخصیت سمجھے جاتے ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک وہ امام شاہ ولی اللہ کے پایے کی شخصیت تھے۔ بعض دیگر اہل علم کا خیال ہے کہ وہ نبوغِ علمی اور فکری عبقریت میں شیخ احمد سرہندی کی ہم سر شخصیت تھے، لیکن ان کا سارا فضل وکمال ایران میں رائج اور مشہور فلسفیانہ بحثوں کی تلخیص واختصار پر مشتمل متون تیار کرنے تک محدود تھا۔ یہ جون پور کی علمی روایت تھی۔

جب امام شاہ ولی اللہؒ عرب دنیا کے تقریباً پندرہ ماہ کے قیام کے بعد وہاں سے ہندوستان لوٹے تو انہوں نے ان تعلیمی نظاموں میں کچھ تبدیلیوں اور پیش رفت کو متعارف فرمایا۔ آپ نے فلسفے، الفاظ، ومتون کی جادوگری اور کتب قواعد کی شروح وحواشی کے بکثرت استعمال میں ضرورت سے زیادہ توغل کا الغا کرڈالا اور ایک بہت سادہ اور نئے نصابِ تعلیم کی آبیاری کی، جسے اولاً ان کے والد گرامی، شاہ عبدالرحیم نے متعارف کروایا تھا۔ امام شاہ ولی اللہ نے اس میں اپنے والد کی سرپرستی میں پڑھے ہوئے نصاب کی تفصیل اپنی خودنوشت سوانح ''الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبدالضعیف'' میں ذکر کی ہے۔ انہوں نے اس نصاب کے مختلف پہلوؤں اور متون پر بھی گفتگو کی ہے۔ ابھی تک فرنگی محل، جون پور یا دیگر متعدد اداروں یا مدارس کے نصاب میں قرآن وحدیث کو کوئی نمایاں اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ تعلیم کسی حد تک عمومی تھی اور اس میں کئی مضامین داخل تھے۔ ایک صاحب علم کے اندازے کے مطابق ایک چھت تلے اور ایک نظام کے تحت تقریباً چھپن مضامین کی تدریس ہوتی تھی۔ مقصد یہ پیشِ نظر ہوتا تھا کہ طالب علم کو علم کی تازہ ترین پیش رفت سے آگاہی فراہم کی جائے۔ اس کی بنیاد مختصر متون تھے جن کا یاد کرنا طالب علم کے لیے ناگزیر تھا، تاکہ اس کے ہاتھ میں مختلف علوم وفنون کے بنیادی مسائل کی ایک کلید ہاتھ آجائے۔ اس نصاب میں طب، حساب، جیومیٹری اور اس طرح کے دیگر فنون شامل ہوتے تھے جن کی اساس ایران، وسط ایشیا یا عرب دنیا کے علماء کے تیار کردہ مختصر متون تھے۔

امام شاہ ولی اللہؒ کا خیال تھا کہ یہ نصاب اس پایے کا اہل اور جید عالم تیار کرنے کے لیے موزوں نہیں تھا جو ان کے پیش نظر تھا۔ دیگر اداروں میں مروج یونانی فلسفے کے مقابلے میں آپ نے قرآن وحدیث اور اسرارِ شریعت کے مطالعے پر زور دیا۔ شاہ صاحب نے متعدد متون تحریر کیے جنہیں داخل نصاب کیا گیا۔ متن حدیث کے مطالعے کے لیے موطا امام مالک مع شروحات لازمی قرار دی گئی۔ متن پر ضرورت سے زیادہ زور کی روایت کم کی گئی۔ برصغیر اور شمالی ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا ادارہ تھا جس میں نصاب کو قرآن، حدیث اور سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بنیاد پر استوار کرنے کی سنجیدہ اور منضبط کوشش کی گئی۔

اس سے پہلے اسی طرح کی ایک کوشش شیخ عبدالحقؒ محدث دہلوی بھی کر چکے تھے جہاں سیرت اور حدیث کی کچھ کتابیں متعارف کروائی گئیں، لیکن شاہ عبدالحقؒ کی وفات کے بعد برصغیر

کی علمی روایت میں ان کوششوں کا راستہ بند ہو گیا۔

یہ صورتِ حال تھی جب مغل سلطنت کا سقوط ہوا۔ مدرسہ فرنگی محل کی روایت وہی رہی۔ شرقِ برصغیر کی روایت جون پور کے طرز ہی پر رہی، البتہ دہلی، لکھنؤ اور ٹھٹھہ (اور بعض دیگر شہروں) کے کچھ (چھے یا سات) مدارس نے امام شاہ والی اللہ کے متعارف کردہ نصاب کی ترویج کی جس میں بنیادی زور فہم قرآن اور متن حدیث کے مطالعے پر تھا۔ جب اٹھارویں صدی کے درمیان برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال، بہار اور اڑیسہ پر قبضہ جمالیا اور مغل بادشاہ، شاہ عالم (شاید شاہ عالم ثانی) کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی بڑھتی ہوئی پیش رفت ایک دن سارے برصغیر کو قابو میں لے لے گی تو اس نے کچھ اقدام کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن اس سیلاب بلاخیز کا کسی عسکری قوت کے ذریعے مقابلہ کرنے کی بجائے اس نے اس اٹھتی ہوئی طاقت سے سمجھوتہ کرنے اور تین صوبوں میں اس کی قوت کو تسلیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ مغل بادشاہ نے کمپنی کو ایک چارٹر جاری کیا جس میں اس کو محصول جمع کرنے، انتظامِ مدنی اور بعض دیگر شہری معاملات کی اجازت دی۔

یہ مغلیہ سلطنت کا بالفعل قانونی زوال تھا۔ انہوں نے اپنی سلطنت کے تین بڑے صوبے گنوا دیے جو اس وقت سب سے مؤثر صوبے شمار ہوتے تھے۔ بنگال اس وقت مغلیہ سلطنت کا سب سے پرثروت صوبہ تھا۔ اورنگ زیب کی سب مہمات کا مالی خرچ بنگال کے لگان سے اٹھتا تھا اور مغلیہ سلطنت کا زیادہ تر مدار اسی کے مالی وسائل پر تھا۔ یہ امیر صوبہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کر دیا گیا اور مغلیہ سلطنت تین صوبوں: بنگال، بہار اور اڑیسہ سے اہل برطانیہ کے حق میں سبک دوش ہو گئی۔

اس سبک دوشی کے موقع پر جس معاہدے پر دستخط ہوئے اس وقت اس عمل کو دستبرداری نہیں کہا گیا مگر عملاً یہ دست برداری ہی کی ایک شکل تھی۔ معاہدے میں یہ کہا گیا تھا کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تو ان کے معاملات کو اسلامی عدالتوں میں، مسلمان ججز، قاضیوں اور مفتیوں کی رہنمائی میں اسلامی شریعت کی رو سے نبھایا جائے گا۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی اس شرط پر راضی ہو گئی اور اس نے تینوں صوبوں کے مختلف حصوں میں عدالتیں قائم کیں۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے آگے بڑھ کر یوپی اور دلی کے گرد و نواح کے دیگر صوبوں پر بھی قبضہ جمالیا اور آخرکار ۱۸۰۶ء میں وہ دہلی میں داخل ہو گئی تو پھر وہی معاہدہ دوبارہ عمل میں لایا گیا، جس میں دیوانی امور کا

قانون کمپنی کو دیگر صوبوں میں لاگو کرنے کی بھی اجازت دی گئی۔ اس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کو مغلیہ سلطنت کی صوابدید پر ہندوستان پر حکومت کرنے کی سرکاری اجازت دے دی گئی۔ ان دنوں جب ایک عمومی اعلان کیا گیا تھا تو قانونی دست برداری کو ان الفاظ میں واضح کیا گیا:

تمام مخلوق اللہ کی ہے، تمام کائنات اللہ کی ہے سلطنت بادشاہ کا حق ہے لیکن سرکاری فیصلے کمپنی بہادر کے ہیں۔

کمپنی نے آغاز میں تو مسلمانوں کو کم از کم یہی تاثر دیا کہ وہ معاہدے کی پاسداری کر رہی ہے اور اسلامی عدالتیں قائم کر رہی ہے۔ اس نے عملاً ایسے کیا بھی، چنانچہ عدالتیں قائم کیں، ان میں قاضی، جج اور مفتیوں کا تقرر کیا۔ اس تقرر میں سہولت اور آسانی پیدا کرنے کے لیے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ قاضیوں کا انتخاب فرنگی محل یا درس نظامی کے فضلا میں سے ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ انگریز بڑے مربوط طریق کار کے حامل لوگ تھے۔ وہ اب بھی نظم کے بہت پابند ہیں اور جب بھی انہوں نے کوئی الٹا یا سیدھا کام کرنا ہو تو وہ اسے ایک ضابطے اور قانون کے تحت ہی کرتے ہیں۔ پہلے وہ کوئی قانون بناتے ہیں، اس کے لیے ضابطے تیار کرتے ہیں، ایک طریق کار مہیا کرتے ہیں اور پھر کام کا آغاز کرتے ہیں، خواہ وہ اچھا ہو یا برا۔ چنانچہ انہوں نے یہ کام بھی ایک قانون اور ضابطے کے تحت ہی کیا۔ وہ طریقہ یہ تھا کہ قاضی یا مفتی وہی متعین ہوں گے جو درس نظامی کے فاضل ہوں گے، ججز کے لیے فقہ حنفی کو ماخذ کی حیثیت حاصل ہوگی۔ اس مقصد کے لیے ہدایہ کا انگریزی ترجمہ کیا گیا۔ فتاویٰ عالم گیری کی انگریزی میں تلخیص کی گئی اور فقہ حنفی کے بعض بنیادی متون کو برطانوی اہل علم نے انگریزی میں منتقل کر دیا۔ اس کا مقصد ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے افسروں کو فقہ حنفی کے مطابق مختلف معاملات کی قانونی حیثیت سے آگاہی فراہم کرنا تھا۔

اس اقدام نے درسِ نظامی کو سارے ہندوستان میں بہت مقبول بنا دیا، کیونکہ یہ فضلا کو اعلیٰ مشاہروں پر ملازمت کے مواقع فراہم کرتا تھا۔ یہ فضلا دیگر اداروں میں کم مشاہرہ پاتے تھے لیکن کمپنی میں ان کو اعلیٰ وظائف دیے جاتے تھے۔ اس وجہ سے درسِ نظامی بہت معروف ہو گیا اور ان دنوں یہ اسی نام سے مشہور ہوا۔ اب ۱۷۶۱ء کے بعد درسِ نظامی بتدریج ہندوستان کے تمام حصوں میں مقبول ہوتا گیا۔ مدارس نے درسِ نظامی کو اپنے نصاب کے طور پر اختیار کرنا شروع کیا،

لیکن تاجِ برطانیہ کی ابھرتی ہوئی طاقت کے ساتھ مدارس کی تعداد کم ہونا شروع ہوگئی جس کی مختلف وجوہ ہیں۔

ایک بہت معروف مدرسہ تھا جو ایک طویل عرصے تک قائم اور جاری رہا۔ اس کا نام مدرسہ غازی الدین تھا اور بعد میں دہلی کالج کے نام سے موسوم ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد اس کالج کو بھی اپنے کنٹرول میں لے کر اس کا ایک نیا نصاب تشکیل دیا۔ بعض بڑے مسلمان اہل علم کا اس میں تقرر کیا۔ ان ہی میں سے ایک عالم مولانا مملوک علی تھے جو دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس مولانا یعقوب نانوتوی کے والد تھے۔ آپ مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی جیسے علما کے استاد تھے۔ یہ تینوں فضلا مدرسہ غازی الدین دہلی کالج کے فارغ التحصیل تھے۔

۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت کے زوال اور اس کے کوکب اقبال کے مکمل طور غروب ہونے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے تمام مدارس کو ختم کر کے رکھ دیا، اوقاف کا نظام تلپٹ کر دیا اور ۱۷۶۵ء میں شاہ عالم کے ساتھ کیے گئے معاہدے کو پس پشت ڈال دیا۔ مسلم عدالتیں باقی نہ رہیں، نفاذِ شریعت کا معاملہ کالعدم ہوگیا اور قاضیوں اور مفتیوں کا وجود مٹ کر رہ گیا اور سب بساط لپیٹ کر رکھ دی گئی۔

مدارس کو اوقاف کی امداد، مرکزی حکومت کی توجہ اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں قائم صوبائی حکومتوں یا امارتوں کی اعانت سے محروم کر دیا گیا اور اسلامی تعلیم کی کسی روایت کو باقی رکھنا ایک بہت بڑا مسئلہ بن کر رہ گیا۔

اس صورتِ حال میں مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، حاجی محمد عابد حسین اور بعض دیگر حضرات سامنے آئے اور دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ ہندوستان میں اسلامی تعلیم اور اس کے اداروں کے ختم کرنے کی جو لہر برپا تھی، اس کے مقابلے میں اسلامی تعلیم اور روایت کی حفاظت کی ممکنہ حد تک حفاظت کی جا سکے۔ یہ لوگ اسی روایت کے تربیت یافتہ اور درسِ نظامی کے متون اور کتب کے فاضل تھے۔ اس لیے انہوں نے مدرسے کے نصاب

کے لیے درسِ نظامی ہی کو اختیار کیا تاہم اس میں دو بنیادی ترمیمات کیں۔ ابتدا میں مولانا رشید احمد گنگوہی کے اصرار پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ منطق اور فلسفے کی کوئی کتاب بھی داخل نصاب نہیں کی جائے گی۔ ان کا خیال تھا کہ اس وقت چونکہ اصل مسئلہ اسلامی علوم کی حفاظت کا ہے، اس لیے قرآن وحدیث، فقہ، اصولِ فقہ اور عربی زبان پر زور دیا جائے اور ان ہی کو پڑھایا جائے۔ اس لیے ان کے نزدیک فلسفے، منطق اور دیگر مضامین کے پڑھانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے ابتدا میں دارالعلوم دیوبند میں ترمیم شدہ درس نظامی کے اندر منطق، فلسفہ اور دیگر علوم شامل نہ تھے۔

دوسری اہم ترمیم یہ تھی کہ درسِ نظامی کے اختتام پر حدیث کے محض تعارفی نصاب کو شامل کیا گیا اور پھر آخر میں ایک مستقل سال حدیث کے خصوصی مطالعے کے لیے مختلف تبدیلیوں کے ساتھ خاص کیا گیا۔ ۱۹۴۷ء تک دارالعلوم دیوبند کی تقریباً نوے سالہ طویل کے دوران میں متعدد تبدیلیاں کی گئیں۔ بعد میں فلسفے اور منطق کے علاوہ حدیث کی کچھ مزید کتابیں (طحاوی، مشکوٰۃ اور موطا امام محمد) بھی شامل کی گئیں۔ کافی بعد میں متن قرآن کا ترجمہ بھی شامل کیا گیا، جو غالباً دوسرے یا تیسرے سال سے شروع ہوتا تھا اور آخر تک چلتا تھا، جس کے نتیجے میں مکمل قرآن ایک مضمون کی حیثیت سے شامل ہو گیا۔ اصولِ تفسیر پر بھی کچھ متون شامل کر دیے گئے۔ شاہ ولی اللہ کی قرآنی فلسفے اور تفسیری اصولوں پر کتاب الفوز الکبیر داخل نصاب کی گئی۔

یہ تبدیلیاں مختلف وقفوں سے کی گئیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں، غالباً ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء میں امام شاہ ولی اللہ کی شاہ کار کتاب حجۃ اللہ البالغۃ کو ایک تکمیلی ضمیمے کے طور پر شامل کیا گیا۔ یہ کتاب دارالعلوم کے فضلاء کو پڑھائی جاتی تھی۔

اس طرح درسِ نظامی ہم تک پہنچا ہے۔ ۱۸۶۷ء (جب عہد برطانیہ میں دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی) سے ۱۹۴۷ء (جب ہندوستان خود مختار بنا) تک دارالعلوم اور اس طرح کے دیگر اداروں (جن کی تعداد ہندوستان کے مختلف حصوں میں ایک ہزار یا اس سے کچھ زائد تھی) کے بنیادی مقاصد دو تھے:

۱۔ مختلف مساجد میں امام اور خطیب مہیا کرنا۔

۲۔ دارالعلوم اور اس طرح کے دیگر اداروں میں اساتذہ کی فراہمی۔

دارالعلوم کے قیام کے یہ دو بنیادی مقاصد تھے۔ آزادی کے بعد خاص طور پر پاکستان اور بنگلہ دیش میں مدارس کے اہداف ومقاصد پر نظر ثانی ضروری تھی۔ اب خاص طور پر پاکستان اور بنگلہ دیش جیسے آزاد مسلم ممالک اور کافی حد تک ہندوستان کے دینی مدارس کے سامنے وسیع تر مقاصد ہیں جن سے ان کو عہدہ برآ ہونا چاہیے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ درسِ نظامی آیا وہی ہے جو شروع میں تھا یا اس میں تبدیلیاں ہوئی ہیں؟ اب ہم کو مساجد میں ائمہ اور مدارس میں مختلف علوم وفنون پڑھانے کے لیے اساتذہ کی ضرورت ہے۔ یہ مدارس بیسویں صدی کے شروع میں اگر سو تھے تو آج اس کے مقابلے میں ہزاروں میں ہیں۔ اب پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش میں مدارس کی تعداد پچاس ہزار کے قریب ہے اور ان میں لاکھوں طلبہ زیر تعلیم ہیں، اس لیے مذکورہ بالا ضرورت یقیناً بڑھ رہی ہے۔ مدارس میں اساتذہ کی فراہمی یقیناً ایک بہت بڑی ضرورت ہے، تاہم اس کے مقابلے میں ہماری تین ضروریات اور بھی ہیں۔

ہمیں سکولوں اور کالجوں کے مرکزی دھارے میں اسلامیات پڑھانے کے لیے اساتذہ درکار ہیں جب کہ پاکستان میں اسلامیات ایک لازمی مضمون ہے۔ ہمارے پاس نصف لاکھ سے زائد ثانوی سکول، دس ہزار تک کالج اور سیکڑوں یونیورسٹیاں ہیں۔ ان سب اداروں میں اسلامیات ایک لازمی مضمون کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ اس لیے ہر ادارے کو مختلف سطحوں پر اسلامیات پڑھانے والا استاد چاہیے۔

پھر ہمیں ایسے اہل علم اور اصحابِ فضل رہنماؤں اور فقہا کی ضرورت ہے جو امت مسلمہ کو درپیش چیلنجز کے بارے میں ہماری ملت کو عمومی راہنمائی دے سکیں۔ ہمیں ایسے ماہرین اقتصادیات کی ضرورت ہے جو پاکستان میں تبدیلی لاسکیں اور موجودہ صورتِ حال میں پاکستان کو ایک اسلامی اور شرعی معاشی نظام دے سکیں۔ اس مقصد کے لیے محققین کی ایک الگ کھیپ درکار ہے۔ (جاری ہے)

تعلیم و تربیت سید خالد جامعی

عصری نصابِ تعلیم کی مقاصدِ تعلیم سے دوری

جدیدیت (Modrenism) کے پیدا کردہ معیارِ زندگی اور اس معیار میں مسلسل و مستقل اضافہ کا اصول سکول کے ایک معصوم بچے کو بھی نفس مطمئنہ سے محروم کر دیتا ہے۔ اس مسئلے کی بنیادی وجہ سکولوں میں پڑھائے جانے والے وہ نصابات ہیں جن کی تشکیل ایک خاص ہدف کے حصول کی خاطر انجام پاتی ہے اور اس کے ازالے کی واحد صورت یہی ہے کہ نصاب تعلیم کی تجدید واصلاح کا کٹھن اور حوصلہ طلب کام اب ہمارے دینی دانشوروں کی کاوشوں کا محور ہو جانا چاہیے اور اس کے لیے اپنی توانائیاں انہیں صرف کرنی چاہئیں ورنہ ہماری آئندہ نسلوں کے فکری ارتداد کا پورا سامان مہیا کیا جا چکا ہے۔

ہمارے ہاں ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ جدید تعلیمی ادارے ہماری تاریخ نے تخلیق نہیں کیے، یہ ہم پر مسلط کیے گئے ہیں، اس نظام کو فی الحال بدلنا ممکن نہیں ہے اور ریاستی قوت کے بغیر اس کا فوری متبادل پیش کرنا بھی اس وقت ممکن نہیں لہٰذا ہم حالت اضطرار میں ہیں۔ لیکن لمحہ موجود میں امریکہ اور کنیڈا میں جدید اسکولوں کا متبادل گھر اسکول، امی اسکول اور ابو اسکول (Home School / Mom School / Dad School) وجود میں آچکے ہیں دنیا کی تیئیس تہذیبوں کی طرح گھروں بستیوں محلوں میں قائم یہ غیر تجارتی (Non Commercial) مکتب جو ہمارے شاندار ماضی کی یادگار ہیں مغرب کے موجودہ نظام تعلیم کے لیے موجودہ سرکاری اور غیر سرکاری اسکولوں سے بہت اچھے، سستے اور بہت بہتر طلباء تیار کر رہے ہیں جو اخلاقی طور پر اور صلاحیتوں کے اعتبار سے بہت برتر ہیں۔ یہ اسکول ماں باپ نے خود اپنی مدد آپ کے تحت قائم کیے ہیں کیونکہ صرف مادی کامیابی کے لیے تخلیق کیے گئے جدید اسکول مغرب کے بچوں کی مادی ضروریات بھی پوری کرنے سے قاصر ہیں اور بے شمار سنگین مسائل پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ مکتب قائم کرنے والے بہت مذہبی لوگ بھی نہیں ہیں ان کا مقصد بچوں کی اخلاقی روحانی ایمانی نورانی تربیت بھی نہیں ہے محض مادی احساس زیاں یعنی ترقی کی رفتار تیز تر کرنے کی خواہش آرزو اور جستجو نے ان کو ایک نئے تجربے اور متبادل نظام پر آمادہ کیا اور وہ صرف مادی طور پر کامیاب ہو گئے

ہیں۔اس خالص مادی ترقیاتی تجربے کو ہم ایک لمحے کے لیے نظر انداز کر کے ایک سوال اٹھاتے ہیں۔کیا جدید سیکولر تعلیمی اداروں میں اصلاحی، دفاعی اور انقلابی تبدیلیوں کے ذریعے ان اداروں کی بنیادوں اور مرتبہ نصاب میں موجود زہر کا علاج ممکن ہے یا نہیں؟ ان میں اصلاح کا کتنا امکان ہے؟ یہ ہمارے سوچنے کا اصل میدان ہے۔

مغرب کے تمام ممالک جو سرمایہ دارانہ نظام کے نظریات لبرل ازم، سوشلزم اور سوشل ویلفیئر ازم پر یقین رکھتے ہیں ان کا اجماع اصولاً آزادی و مساوات کے عقائد پر ہے۔ وہ خدا، نبی، آخرت وغیرہ کے قائل نہیں۔ان کا نظام تعلیم بھی انہی عقائد کے مطابق بچوں کی تعلیم و تربیت کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔تعلیم کا مقصد محض ترقی، لذتوں کا حصول، آزادی اور معیار زندگی میں مسلسل و مستقل اضافہ ہے۔ اس کے باوجود ایک مغربی سوشلسٹ ملک نے اسی مفاد پرست، حاسد، حریص تعلیمی نظام میں چند بنیادی اصلاحات، چند ترمیمات اور اضافوں کے ذریعے ڈاکٹر بننے والوں میں حرص و حسد و ہوس کے جذبات پیدا کرنے کی بجائے قوم پرستی اور انسان پرستی کے ذریعے خدمت خلق کا ایسا جذبہ پیدا کیا ہے جس کی مثال پوری دنیا میں نہیں ملتی۔ دنیا کی تاریخ میں سب سے بڑے طبی مشن اس ملک کے ڈاکٹروں اور طبی عملے پر مشتمل ہیں جو مختلف غریب کمزور ممالک میں بلا معاوضہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ بیک وقت چھپن ہزار لوگ اس عمل میں شریک ہیں۔مگر ان میں سے ایک بھی کسی دوسرے ملک کی شہریت قبول نہیں کرتا جبکہ اس ملک میں ڈاکٹروں کی تنخواہیں بہت کم بلکہ دنیا میں سب سے کم ہیں۔تفصیلات کے لیے نوم چومسکی کی کتاب *Profit over people* کا مطالعہ کیجیے۔ بڑے بڑے عالمی ادارے، UNO، UNICEF، WHO، OXfam، UNO، ریڈ کراس بھی اربوں کھربوں روپے کے فنڈز وصول کرنے کے باوجود اتنے بڑے پیمانے پر مفت طبی امداد فراہم کرنے سے قاصر ہیں۔

کفار اگر کفر کے نظام تعلیم میں تجربات کے ذریعے کچھ اصلاحات لا سکتے ہیں تو امت مسلمہ جو چودہ سو سال کی تاریخ رکھتی ہے وہ اس نظام تعلیم میں جزوی اصلاحات کے لیے بھی کیوں آمادہ نہیں ہے؟ اور کیا وجہ ہے عالم اسلام ایسی مثالیں پیش کرنے سے قاصر ہے؟ اس مثال کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مذکورہ ملک کا تجربہ عالم اسلام کے لیے کوئی عالی معیاری اور مثالی نمونہ ہے بلکہ صرف

یہ بتانا مقصود ہے کہ تبدیلی کی خواہش ارادہ اور عزم ہو تو ہر طرح کے مشکل حالات اور سخت سے سخت نظام میں بھی کوئی نہ کوئی راستہ نکل آتا ہے۔ عالم اسلام کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ جدیدیت کا مقابلہ کرنے کی بجائے اس سے مغلوب مسحور اور مرعوب ہو گیا ہے بلکہ وہ جدیدیت کے تمام مظاہر و آثار اسلامی تاریخ میں تلاش کر رہا ہے۔ جزئیات کی بنیاد پر کلیات اخذ کر کے مغربیت جدیدیت اور لادینیت کی اسلامی تعبیریں پیش کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ لہٰذا عقل صرف ان امور میں استعمال کی جارہی ہے جہاں اس کے استعمال کی ضرورت نہیں اور جہاں عقل کی ضرورت ہے وہاں مغرب کی کامل تقلید اختیار کر لی گئی ہے۔ مغرب کے فلسفے اس کے علوم اور اس کے اداروں کا ناقدانہ جائزہ لینے کی بجائے ہم اسلامی علمیت، اس کے مکاتب فکر اور ان کے اختلاف، اسلام کے اداروں اور اُن کی تاریخ کا ناقدانہ جائزہ لینے میں مصروف ہیں، لہٰذا مغرب محفوظ ہے اور اسلام مضروب، مجروح اور محبوس ہے۔

جدید سیکولر تعلیمی اداروں کی مثال دنیا کی اب تک وجود میں آنے والی تئیس تہذیبوں میں نہیں ملتی، دنیا کی تاریخ میں کبھی کوئی نظام تعلیم مادہ پرستی شکم اور شہوت پرستی کی بنیاد پر تعمیر نہیں کیا گیا۔ ہر تعلیمی نظام کسی اعلیٰ ترین تصور خیر (Meta Narrative) کی فوقیت اور فروغ کا فریضہ انجام دیتا تھا۔ تعلیم کا مقصد روٹی کمانا نہیں تھا علم حقیقت مطلقہ (Absolute Reality) اللہ ربّ العزت کی معرفت تک پہنچنے کا ذریعہ تھا۔ مگر عصر حاضر میں تعلیم کا اصل مقصد آزادی، مساوات اور ترقی کا حصول ہے لہٰذا علم وہ ہے جس سے مال و دولت کثرت سے حاصل ہوتے ہوں لہٰذا ہر شخص حصول دولت کے لیے علم حاصل کرتا ہے۔ یہ محض دعویٰ نہیں ہے اس کی دلیل بھی موجود ہے۔ اگر آج دنیا کی تمام حکومتیں اعلان کر دیں کہ کسی سرکاری غیر سرکاری یونیورسٹی سے سند لینے والے کو کسی ادارے میں ملازمت نہیں ملے گی تو تمام اسکول یونیورسٹیاں ویران ہو جائیں گی یہ تعلیم علم کے لیے نہیں روٹی کمانے کے لیے ہے اس کا تعلق العلم سے نہیں صرف عقلی علوم، سائنس، سوشل سائنس، آرٹ کرافٹ اور فنون سے ہے جسے دنیا کی تئیس تہذیبوں میں علم نہیں سمجھا جاتا تھا اور تجربی، سائنسی، حسی، عقلی علوم کی تلچھٹ کہا جاتا تھا اسی لیے سقراط، افلاطون اور ارسطو کے ہاتھوں سوفسطائیوں کو شکست ہوئی تھی جو پیسے لے کر فنون بیچتے تھے اور اسے علم کہتے تھے۔ علم خرید و فروخت کی شے نہیں ہے۔

بہت سے لوگ یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ اگر بچہ اسکول کالج یونیورسٹی سے علم حاصل کر کے پیسہ نہ کمائے تو کیا کرے، علم سے شعور، اعتماد، عزت، دولت، شہرت ملتی ہے تو اس کے حصول میں کیا ہرج ہے؟ یہ دلیل بظاہر مضبوط لگتی ہے لیکن دراصل کمزور ہے کیونکہ اب دنیا میں پیسہ کمانے کے لیے علم نہیں کرتب بازی کی ضرورت ہے مثلاً فٹبال کرکٹ اسکواش کھیلنے والے جاہل کھلاڑی ارب پتی بن جاتے ہیں۔ فلم اور ٹی وی میں کام کرنے والے جاہل اینکر پرسن، پانسے پھینکنے والے سٹے باز (Risk Managers)، جاہل صحافی، مسخرے بھانڈ، اداکار، کسبیاں کھربوں روپے کماتے ہیں۔ جاہل سٹے باز، حجام، درزی جن کو اب فیشن ڈیزائنر کہتے ہیں آرٹسٹ، فوٹوگرافر، مصور، ماڈل، رقاص اعلیٰ تعلیم کے بغیر اتنا دھن کماتے ہیں کہ انسان اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ عزت اسی کو ملتی ہے جو مال و دولت میں سب سے آگے ہے۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ علم سے دولت ملتی ہے جدیدیت اور مغربیت سے ہماری ناواقفیت کا عمل ہے۔ کنیڈا میں ٹرک ڈرائیور ڈاکٹر سے زیادہ پیسے کماتا ہے برطانیہ میں تندور پر روٹی لگانے والے کی تنخواہ ڈاکٹر سے زیادہ ہے۔

ٹنڈو جام یونیورسٹی کے ایک سابق وائس چانسلر نے جنگ کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا تھا کہ ان کا بیٹا حجام بننا چاہتا ہے۔ صحافی کو حیرت ہوئی تو جواب ملا جن دنوں مَیں امریکہ میں مقیم تھا ہمارے محلے میں ایک حجام تھا جس سے ہم بال کٹواتے تھے اس کی آمدنی مجھ سے کئی گناہ زیادہ تھی تو بیٹے نے کہا کہ ابو آپ سے بہتر تو حجام ہے جو اتنا کما لیتا ہے جب تہذیب کا نقطہ کمال مال کی فراوانی اور تعیش کی ارزانی ہو تو یہ تصور خیر ایک نئے انسان کی تعمیر کرتا ہے جسے ہم جدید انسان (Modren Man) کہتے ہیں۔ جدید تعلیمی اداروں سے ایسے ہی لوگ نکلتے ہیں۔

جاہل سیاست دان بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوتے ہیں اور راتوں رات کروڑ پتی، ارب پتی پھر چند سالوں میں کھرب پتی ہو جاتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایسا صرف پاکستان اور تیسری دنیا کے مما لک میں ہوتا ہے لیکن دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت امریکہ اور بھارت میں بھی یہی ہوتا ہے۔ ریگن ہالی وڈ کا ایک اداکار امریکہ کا صدر بن سکتا ہے اور واجپائی، مودی جیسے جاہل بھارت کے وزیر اعظم بن جاتے ہیں۔ جمہوریت میں ایسا ہی ہوتا ہے پوری دنیا میں یہی ہو رہا ہے۔ اس کی تفصیل جاننے کے لیے نیوز ویک کے سابق مدیر اور صدر بش کی کچن کیبنٹ کے رکن فرید زکریا کی کتاب The Future of Freedom پڑھیے۔ دنیا بھر کی جمہوریتوں کے

جاہل سیاستدانوں کی تاریخ آپ کومل جائے گی۔فرید زکریا نے لکھا ہے کہ امریکہ میں ۵۸ فیصد فیصلے کانگریس اور سینٹ میں عوام کے نمائندے نہیں کرتے بلکہ لابیاں، پریشر گروپ اور مختلف گروہ کرتے ہیں۔ظاہر ہے الیکشن جیتنے اور ہارنے کے لیے کھربوں روپے کی امداد دینے والے مفادات کیوں حاصل نہ کریں؟تعلیم ،سیاست،علم سب کا ایک ہی مقصد ہے سرمایہ میں اضافہ جس سے آزادی میں اضافہ ہوتا ہے یہی عہد حاضر کا مذہب ہے اسے سرمایہ دارانہ نظام بھی کہتے ہیں۔

جدیدیت(Modrenism)،لادینیت(Secularism)اور سرمایہ داری وجمہوریت (Capitalism & Democracy) کی پیدا کردہ جدید دنیا میں شہرت عزت اور دولت کا معیار علم نہیں ہے بلکہ سائنسی علم بھی نہیں بلکہ علم کا معیار یہ ہے کہ کون اپنے کام،فن سے سب سے زیادہ سرمایہ پیدا کرسکتا ہے کیونکہ آزادی صرف سرمایہ سے حاصل ہوتی ہے اسی لیے مغرب میں کام(Work) کی تعریف یہ ہے کہ جس سے سرمایہ حاصل ہو۔کام کا نہ ہونا پاگل پن ہے یعنی جو شخص کام نہیں کرتا سرمایہ نہیں کماتا وہ اپنی آزادی کا انکار کرتا ہے۔آزادی مغرب کا بنیادی ایمان وعقیدہ ہے لہٰذا آزادی اور سرمایہ کا منکر پاگل ہے۔فوکالٹ لکھتا ہے The absence of work is madness اسی لیے گھر میں تیرہ بچوں کو پالنے والی عورت کے کام کو مغرب کام تسلیم نہیں کرتا کہ اس سے سرمایہ نہیں پیدا ہوتا۔یہ عورت باہر جائے کمائے تو اسے working woman کہتے ہیں۔رنڈی اپنی ملکیت جسم کو بیچ کر سرمایہ کما کر اپنی آزادی میں اضافہ کرتی ہے لہٰذا اسے طوائف نہیں sex worker کہتے ہیں،محنت کے ذریعے آزادی اور سرمایہ جیسے عظیم کام انجام دینے والی عورت۔جدید سیاسی فلسفے کا سب سے بڑا مفکر جان رالز جس کی کتاب Theory of Justice جدید ریاستوں میں عدل کے موضوع پر انجیل سمجھی جاتی ہے وہ لکھتا ہے کہ ہر انسان کو چار بنیادی خیر (Four Primary Goods) حاصل ہونے چاہئیں: آمدنی،دولت،قوت اور اقتدار(Incom / Wealth / Power / Authority)ان چار بنیادی خیر کے بعد ہی کوئی شخص اپنی آنکھوں میں عزت وتکریم (Self Respsct) کے قابل ہوسکتا ہے۔دوسرے معنوں میں کوئی شخص اپنی نگاہ میں بھی ان چار بنیادی اسباب کے بغیر عزت کے قابل نہیں۔جس شخص کو اپنی نگاہوں میں ان چار عقائد کے بغیر عزت حاصل نہیں اسے دوسرے کی نگاہوں میں

عزت کیسے مل سکتی ہے؟ جدید نظام تعلیم ہمیں یہی عزت دلانے کا فریضہ انجام دیتا ہے کہ عزت کے پیمانے تبدیل ہو چکے ہیں۔ دوسرے معنوں میں ہمارے عقیدے، ایمانیات اور مابعد الطبیعیات بھی بدل چکے ہیں لہٰذا جس کے پاس مال و دولت اور اسباب کی فراوانی نہیں ہے وہ عزت کے قابل ہی نہیں ہے۔ افسوس کہ دنیا کی تاریخ کے بڑے بڑے لوگ اس پیمانے پر پورا نہیں اُترتے۔

دنیا بھر میں عموماً اور عالم اسلام میں خصوصاً سائنس کو برتر علم جانا جاتا ہے لیکن سائنس دان (Scientists) کی مغرب میں اتنی عزت نہیں کی جاتی جتنی عزت سٹے باز (Risk Managers) رنڈیوں، مراثیوں، بھانڈوں (Showbuisness Stars) اور کھلاڑیوں (Sports men) کی ہوتی ہے۔ عزت کا پیمانہ مغرب اور دنیائے جدید (Modren Age) میں صرف مادی ہے اور وہ ہے پیسہ۔ جو زیادہ کماتا ہے وہ زیادہ عزت پاتا ہے سب سے زیادہ پیسہ سٹے باز کماتے ہیں اس کے بعد رنڈیاں اور کھلاڑی وغیرہ اس کے بعد سائنس دانوں کا نمبر آتا ہے۔ کیونکہ سٹے باز اور رنڈیاں سرمایہ کی پیداوار میں سائنس دانوں سے زیادہ بہتر ہیں مثلاً عالمی اولمپکس کے ایک ہفتے کے کھیل سے جتنا سرمایہ پیدا ہوتا ہے امریکہ کی تمام یونیورسٹیاں سال بھر میں اتنا سرمایہ پیدا نہیں کرسکتیں۔ صرف امریکہ میں عریانی وفحاشی کی صنعت ایک سال میں جتنا سرمایہ پیدا کرتی ہے دنیا کی کئی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیاں (جن میں مائیکروسافٹ کمپنی بھی شامل ہے) اجتماعی طور پر بھی اتنا سرمایہ پیدا نہیں کرتیں کرس ہیجز کی کتاب دیکھ لیجیے۔

"World wide pom revenues topped 97 billion Dollars in 2006. That is more than the revenues of Microsoft, Google. Amazon, e Bay, Yahoo, Apple, Net Flix & Earth link Combined." [Chris Hedes, Empire of illusion: The end of literacy & the triumph of spectalce, Nation Books USA 2009, p.58]

چونکہ دین دنیا پرستی، مادّہ پرستی (Materialism)، زن پرستی (Women Worship) اور عیش پرستی کی دلیلیں مہیا کرنے سے قاصر ہے لہٰذا دین کی تشکیل جدید، تعبیر نو، تعمیر

نو، بلکہ تخریب نو(Reconstruction of Religious Thought) کا کام زور وشور سے جاری ہے۔ ہماری نئی نسل اگر دنیا پرست بن گئی ہے بہترین مستقبل کے لیے ترک وطن کرکے دارالحرب میں قیام اگر اس کی اولین ترجیح ہے، اگر عام اسلام سے ذہانت کا انخلا (Brain Drain) ہو رہا ہے ہر شخص دولت کے زیادہ سے زیادہ حصول کو اگر اپنا مقصد زندگی بنا چکا ہے تو اس کا سبب ہمارا یہ نیا عقیدہ ہے کہ دین و دنیا برابر ہیں کیونکہ دنیا پہلے ہے آخرت بعد میں۔ لہٰذا دنیا پہلے دین بعد میں۔ بعض جدیدیت پسند کہتے ہیں کہ قرآن میں بھی آتا ہے [illegible] حَسَنَۃً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَۃً ہمارے تعلیمی ادارے ایسی ہی نسل تیار کر رہے ہیں جو رسوم ورواج، عادات واطوار اور بعض مظاہر کی سطح پر مذہبی ہو لیکن ذہنی، قلبی، عقلی طور پر مادہ پرستی کی غلام ہو۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ہم بچے کو ایک ماہ کی عمر میں ڈے کیئر سینٹر اور ڈیڑھ سال کی عمر میں اسکول کے سپرد کرکے اس کی آزادی سلب کر رہے ہیں لیکن اپنی آزادی میں اضافہ کر رہے ہیں کہ عصر حاضر کی ماں سے نہ بچے کا بوجھ اٹھایا جاتا ہے اور نہ اس سے گھر میں دن بھر شور برداشت کیا جاتا ہے۔ بچے، ماں اور گھر والوں کی آزادی کا تقاضا یہی ہے کہ بچے کو ڈے کیئر سینٹر یا اسکول بھیج کر آزاد کر دیا جائے۔ جس معاشرے میں ڈے کیئر سینٹر کھلتے ہیں اسی معاشرے میں اولڈ ہوم بھی کھولنے پڑتے ہیں۔ جب ماں باپ کے پاس بچے کے لیے وقت نہیں ہے، انہیں سرمایہ اور آزادی چاہیے، تو بچے کے پاس بھی آپ کے بڑھاپے میں آپ کی خدمت کے لیے وقت نہیں ہے اسے بھی سرمایہ اور آزادی چاہیے۔ یقیناً ڈے کیئر سینٹر، اسکول، اولڈ ہوم ہماری آزادی میں بے پناہ اضافہ کر دیتے ہیں۔ لیکن کیا ہمیں آزادی کی یہ منحوس شکلیں قبول ہیں؟ ہماری اسلامی تاریخ اور دنیا کی تیئیس بڑی تہذیبوں میں یہ تینوں ادارے کیا موجود تھے؟ بلکہ ان تہذیبوں میں ہسپتال، جیل خانے، ہوٹل، ریسٹورینٹ، پاگل خانے، زچہ خانے، بھی نہیں تھے تو سوال یہ ہے کہ کیوں نہیں تھے؟

جدیدیت کے اس طوفان سے قبل لوگ میٹرنٹی ہوم کے بغیر پیدا ہوتے تھے۔ اہرام مصر، دمشق کی اموی مسجد، تاج محل، قرطبہ، عاد وثمود، مصر، روم، یونان، ایران، چین، ہندوستان اور بابل ونینوا کے عجائبات تعمیر کرنے والے اسکول کالج انجینئر یونیورسٹی، آرٹ اسکول کے بغیر یہ کمالات

کیسے تخلیق کرتے تھے؟ کم از کم ان سوالات پر غور کی ضرورت تو ہے!

اللہ کی عبادت کا بچے کو سات سال میں کہا جاتا ہے۔ مادہ پرستی، ترقی، مال و دولت کی عبادت ایک سال کی عمر سے پہلے فرض ہو جاتی ہے اس کا نام آزادی ہے۔ ایک جانب مغرب تنوع کی بات کرتا ہے دوسری جانب اسکول میں خاص قسم کا لباس پہنا کر تنوع ختم کر دیا جاتا ہے۔ اللہ کے گھر میں عبادت کے لیے آنے والوں کے لیے لباس کی کوئی خاص شکل یا رنگ مخصوص نہیں کیا گیا مگر اسکول میں خاص لباس کے بغیر داخلہ ممنوع ہے اسے آزادی کہتے ہیں۔ یعنی حصول آزادی کے لیے پابندی کا سخت ترین نظام۔ بہت سے ملکوں میں تعلیم لازمی ہے اس کے بغیر آزادی نہیں مل سکتی۔ دوسرے معنوں میں لوگوں کو آزادی، سرمایہ داری، لبرل ازم، سیکولرازم کا جبر نظر نہیں آتا اسلام کا جبر سب کو نظر آجاتا ہے۔ آزادی کا ہر جبر جائز قانونی اور حقیقی ہے مذہب کا تھوڑا سا جبر بھی ناجائز اور غیر قانونی ہے۔ اسکول آزادی اور سرمایہ (School is the tyrany of Freedom & Capital) کا جبر ہے یہ جبر عین حق ہے۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ تعلیم اور عورتوں کی تعلیم پر اس قدر زور کیوں ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ عورت کو مرد کے برابر لانے بلکہ مرد جیسا بنانے کا فائدہ کسے ہے اور کیسے ہے؟ تعلیم عام کرنے کے لیے مغربی ممالک اربوں کھربوں روپے کیوں خرچ کر رہے ہیں؟ UNO تعلیم عام کرنے کے لیے Marriage Free Zone تو بنا رہی ہے لیکن Rape Free Zone کیوں نہیں بنا رہی؟ ان سوالوں کا جواب اس صدی کے سب سے بڑے سیاسی فلسفی John Rawls نے اپنی آخری کتاب میں کس خوبصورتی سے دیا ہے:

"China has imposed harsh restrictions on the size of families & have adopted other draconian measures but ther is no need to be so harsh. Instructive here is the Indian state of Kerala, which in the late 1970s empowered women to vote & to participate in politics to receieve and use education & to own & manage wealth & property. As a result, within next few years birth rate fell below china's without invoking the

corecive powers of the state. China's birth rate in 1979 was 2.8 Kerala's 3.0. In 1991 these rates werw 2.0 & 1.8 respectively. [John Rawls, the Law of People with the Idea of Public Reason Revisited, Harvard Univesity Press, USA. 2003, p/ 110]

جدید نصاب کی کتابوں میں کس قسم کی معاشرت کس قسم کا طرزِ زندگی بتایا گیا ہے؟ کتاب بچے کے لیے پری نرسری کی سطح پر آئیڈیل ہوتی ہے کیونکہ اس کی شخصیت بننے کے عمل میں ہوتی ہے پڑھایا وہ جاتا ہے جو عالی مثالی و معیاری (Superior Ideal, Standrised) ہو، آپ کے دین، تاریخ، تہذیب، علمیت اور کلیت سے ہم آہنگ ہو تو کیا یہ نصابی کتابیں اس معیار پر اُترتی ہیں؟ آکسفرڈ کی کتابیں ایک خاص طبقہ اشرافیہ (Elite Class) کے طرزِ زندگی کی ترجمانی کرتی ہیں جس کا حصول ننانوے اعشاریہ ننانوے فیصد لوگوں کے لیے قیامت تک ناممکن ہے۔ آپ اعشاریہ ایک فیصد لوگوں کے طرزِ زندگی کو معیاری اور مثالی طرزِ زندگی کے طور پر پیش کر کے بچوں کو کس چیز کی طرف دعوت دے رہے ہیں؟ دنیا کی طرف یا آخرت کی طرف، حقیقت کی طرف یا خواب کی طرف، مادہ پرستی کی طرف یا خدا پرستی کی طرف۔ بچہ اپنی کتابوں میں ایک خاص مادہ پرستانہ، پرتعیش، چھچھورے، غیر ذمہ دارانہ، غیر اخلاقی، احمقانہ، جاہلانہ طرزِ زندگی کو دیکھے گا تو کیا وہ اس سے مختلف طرزِ زندگی کو حیرت یا حقارت کے ساتھ نہیں دیکھے گا؟ وہ کتابوں میں بتائے گئے اس غیر حقیقی، ناممکن طرزِ زندگی کے حصول کا خواب بچپن سے دیکھے گا اور جب اسے پا نہ سکے گا تو یقیناً وہ خود کو محروم مجبور بے بس اور بے کس تصور کرے گا۔ جدید سیکولر نظامِ تعلیم اس طرزِ زندگی کے حصول کی آرزو اور جستجو کو زندگی کا اصل ہدف بناتا ہے۔ مختصراً اس نظام کا مقصد ناممکن کی جستجو ہے۔ جو ممکن ہے اس نظامِ تعلیم کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کیا ان کتابوں سے بچے کی مذہبیت، اخلاقیات، ارادوں، عزائم، خواہشات میں بنیادی نوعیت کا تغیر واقع نہیں ہوگا؟

جدید اسکول کا نظامِ تعلیم عقلیت آزادی لذت پرستی افادہ پرستی نتائجیت پرستی حسیت پرستی، تجربیت اور حقوق طلبی (/ Rationalism / Freedom / Hedonism (utalitarianism / Pregmatism / Empiricism / Demand of Rights

کے عقائد کی تعلیم دیتا ہے اور اسی کے مطابق نسل نو کی تعلیم وتربیت کرتا ہے لہٰذا ان اداروں سے نکلنے والا وجود صرف ایک مادی وجود ہوتا ہے وہ نورانی، روحانی، ایمانی اور اخلاقی وجود نہیں ہوتا۔ اسی لیے جدیدیت کے منہاج میں انسانی نفس ایک آزاد، خودمختار، فاعل مطلق، حق خودارادیت کا حامل ہے جس کے تزکیہ نفس کا کوئی نظام کسی نظریے (لبرل ازم، نیشنل ازم، سوشلزم، ہیومن ازم، فاشزم، فیمن ازم، انارکسزم) میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔

سیکولر نظام تعلیم میں اسلامیات کا ایک پیرپڑ پڑھانے، تجوید، ترجمے اور دعائیں یاد کرانے سے کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آسکتی کیونکہ جو ذہنی سانچہ اور فکری ڈھانچہ یہ نظام تعلیم تخلیق کرتا ہے اسے اسلام کی جزوی تعلیم سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ برطانیہ کے تمام تعلیمی اداروں میں انجیل کی تعلیم لازمی ہے مگر وہاں کے اسکولوں اور معاشرے کی مجموعی اخلاقی صورت حال کیا ہے یہ سب کے علم میں ہے کچھ یہی حال عالم اسلام کے اسکولوں کا ہے۔

آزادی مساوات اور ترقی کے عقیدے کے نتیجے میں تزکیہ نفس، اخلاقیات، انسان کے باطن کی تعمیر، اس کی اصلاح جدید لبرل سیکولر جمہوری غیر جمہوری ریاست کے اہداف میں شامل نہیں رہی اس کا نتیجہ امریکہ اور یورپ میں کیا نکلا تمام نسلیں مجرم، بدکردار اور گناہوں میں گرفتار ہیں اخلاقی طور پر ان کا جو حال ہے وہ بیان سے باہر ہے۔

آج تعلیم یافتہ ہونے کا تاثر دینے کے لیے دنیا بھر میں ابلاغ عامہ (Mass Media) سے پروپیگنڈے کے ذریعے دیہی زندگی حقیر بنادی گئی ہے۔ اس حقیر، ذلیل زندگی سے چھٹکارے کا راستہ آج کا نظام تعلیم باور کرایا گیا ہے۔ تعلیم عام ہونے کے نتیجے میں دیہات سے شہروں میں منتقل ہونے والی دیہی آبادی کے بعد دیہاتوں کی زمینوں اور کاروبار پر ملٹی نیشنل کارپوریشن کا قبضہ ہوگا۔ تعلیم عام (Mass education) ہونے کے بعد چھوٹے کاروبار، ذاتی تجارت، خاندانی ہنر نسل درنسل چلے آنے والے آبائی فنون، دستکاری، گھریلو صنعتیں، خاندانی زراعت وغیرہ سب ختم ہوجائیں گے۔ کیونکہ لوگ ان پیشوں، صنعتوں کاموں کو حقیر ذلیل سمجھنے لگتے ہیں۔ آج کل دیہاتوں میں ریوڑ چرانے والے دستیاب نہیں ہیں یہ کام بچے کرتے تھے ان کو چائلڈ لیبر کہا گیا اور ترقی کے لیے تعلیم کے سپرد کردیا گیا۔ کھیتوں میں کام کرنے والے کم

ہو گئے ہیں سب شہر جا کر ترقی کرنا چاہتے ہیں انہیں میڈیا اور تعلیم کے ذریعے یقین دلا دیا گیا ہے کہ وہ غیر ترقی یافتہ ہیں۔ترقی کی اصطلاح دنیا کی کسی تہذیب میں موجود نہ تھی مغربی استعمار کی اس اصطلاح کا اصل مطلب کیا ہے اس کے لیے Development Dictionary کا مطالعہ کیجیے۔ترقی کے نتیجے میں لوگ اپنے آبائی علاقوں ،تاریخ ،تہذیب، آبائی پیشوں ، خاندان سے کٹ کر جدید اداروں کے غلام بن رہے ہیں۔سرمایہ دارانہ نظام کو سستے مزدور مل رہے ہیں جب عورتیں بھی تعلیم پا کر مردوں کے شانہ بشانہ ہوں گی تو کارپوریٹ سیکٹر کو مزید سستے مزدور ملیں گے۔ شہروں کے اندر روایتی اجتماعیتیں بڑے پیمانے پر منتقلی (Mass Mobilization) کے باعث تتر بتر ہو رہی ہیں اجتماعیت (Collectivity) کی جگہ ہجوم (Mass) نے لے لی ہے۔ انسان شہروں کی بھیڑ میں تنہا رہ گیا ہے اپنی جڑ سے کٹنے کے بعد وہ دیہاتوں کی طرف واپس جانے کے قابل نہیں رہا اپنے ہی وطن میں اجنبی اس مسافر کا ماضی حال اور مستقبل اس مریض ہجر کی طرح ہے جو امید سحر سے محروم ہے۔شہروں میں غیر فطری بے پناہ آبادی نے افقی عمارتوں کا ایک بے ہنگم جنگل کھڑا کر دیا ہے۔معاشرتی ثقافتی روایتی تعلیمات ختم ہو گئی ہیں کوئی کسی کو نہیں جانتا لہٰذا تمام جدید بڑے شہر جرائم کے سب سے بڑے مراکز ہیں۔ جرائم اور مجرموں کے انسائیکلو پیڈیا چھپ رہے ہیں۔ بلاشبہ دنیا میں سب سے بہترین تعلیم ،ترقی یافتہ مغربی ملکوں میں ہے سو فیصد لوگ تعلیم یافتہ بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ نفسیاتی مریض،سب سے زیادہ پاگل ،سب سے زیادہ جنونی، وحشی سب سے زیادہ بیمار،سب سے زیادہ طلاقیں،ٹوٹے ہوئے گھر ،آوارہ نسلیں،سب سے زیادہ جنسی درندے،سب سے زیادہ مجرم،سب سے کم بچے ،سب سے کم شادیاں،سب سے زیادہ زنا کاری،سب سے زیادہ محرم رشتوں سے جنسی تعلقات (Incest Relation) سب سے زیادہ تنہائی بے سکونی اور خودکشیاں ، گھروں سے محروم سب سے زیادہ بوڑھے بچے عورتیں،انہی ترقی یافتہ ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔

ان گزارشات کا مقصد موجودہ ڈھانچے میں بہتری پیدا کرنے اور اپنی تہذیب ،علمیات اور اقدار کے موافق نظام تعلیم تشکیل دینے کی طرف اہل فکر و درد کی توجہ مبذول کرانا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کی کوشش کرنے والوں کا حامی و ناصر ہو(آمین)۔

میڈیا

پروفیسر محمد عاصم حفیظ*

ٹرمپ، بلاگرز اور کشمیر

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی پریس کانفرنس کی ویڈیو سوشل میڈیا پر بڑے پیمانے پر شیئر کی جا رہی ہے جس میں وہ ایک صحافی کو سوال کرنے سے روکتے ہیں، اس کی بات نہیں سنتے اور خود سکیورٹی اہلکاروں کو اشارہ کرتے ہیں کہ اس صحافی کو قابو کیا جائے جس پر اسے زبردستی ہال سے باہر بھیج دیا جاتا ہے۔ اس ویڈیو سے نہ صرف امریکہ بلکہ شاید دنیا بھر کے مستقبل کی ایک جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ امریکہ نے کئی مسلم ممالک کے شہریوں کے داخلے پر پابندی لگادی ہے جبکہ پاکستان سمیت دیگر ممالک کو بھی وارننگ دی گئی ہے۔ چند روز پہلے کھیل کے میدان میں بھی دو منفرد واقعات ہوئے۔ پاکستانی نژاد جنوبی افریقی کرکٹر عمران طاہر نے ایک میچ کے دوران وکٹ حاصل کرنے کے بعد اپنی شرٹ لہرائی جس پر طیارہ حادثے میں شہید ہونے والے نامور نعت خواں جنید جمشید کو خراج تحسین پیش کیا گیا تھا۔ انہیں فوری طور پر کرکٹ کے اعلیٰ حکام کی جانب سے سخت تنقید اور وارننگ کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی طرح یورپ میں کھیلے جانے والے ایک فٹ بال میچ میں ایک کھلاڑی پر شامی مہاجرین کے بارے چند الفاظ بولنے پر جرمانہ عائد کر دیا گیا۔ حالانکہ ایسی سیکڑوں مثالیں موجود ہیں کہ جب مختلف کھیلوں کے مقابلوں کے دوران کھلاڑیوں کی جانب سے اسرائیل کے حق میں سلوگن لہرائے گئے۔ ایسے اشارے اور نعرے بلند کیے گئے جن کا مقصد اسرائیل کو سپورٹ کرنا تھا لیکن کبھی بھی کسی تنظیم یا کھیلوں کے ادارے کی جانب سے کوئی ایکشن نہیں لیا گیا۔ ایسا لگ رہا ہے کہ عالمی سطح پر کچھ ایسا بندوبست کیا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کی آہ و پکار اور اسلام کی ہلکی سی آواز تک کو بھی دبا دیا جائے۔ نام نہاد آزادی اظہار کے علمبردار اسلام پسندوں سے بولنے تک کا حق چھیننا چاہتے ہیں لیکن یہی عالمی سامراجی قوتیں عالم اسلام میں کچھ گروپوں اور افراد کو کھل کر اظہار خیال کا موقع بھی تو دینا چاہتی ہیں۔

پاکستان میں چند روز قبل لاپتہ اور اب بازیاب ہو کر یورپ پہنچنے والے ''بلاگرز'' بھی تو اسی سلسلے کی ایک کڑی لگتے ہیں۔ ان کے بازیاب ہوتے ہی توہین اسلام کے وہ تمام سوشل میڈیا نیٹ ورکس، ٹوئیٹر اور فیس بک اکاؤنٹ دوبارہ سے سرگرم ہو چکے ہیں۔ امریکہ اور دیگر ممالک کی جانب سے ان کے لاپتہ ہونے پر تشویش کا اظہار کیا گیا تھا۔ پاکستانی حکومت پر دباؤ کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ان بلاگرز کی ''شان میں گستاخی'' پر نامور اینکر عامر لیاقت کی زبان

*asimmas27@gmail.com

بندی کر دی گئی۔ پاکستان میں ایک کہاوت مشہور ہے کہ اگر نزلہ زکام امریکی صدر کو ہو تو دوا پاکستانی حکمران کھاتے ہیں۔ نائن الیون کے بعد صرف ایک فون کال پر امریکہ کے ہر حکم کی بجا آوری کو تسلیم کر لیا گیا تھا بلکہ اس وقت کے وزیر خارجہ کولن پاول کے الفاظ میں ’’جو ہمیں امید نہیں تھی وہ بھی مان لیا گیا‘‘۔ کچھ ایسا ہی حافظ سعید کی نظر بندی اور زبان بندی کی صورت میں کیا گیا ہے۔ نئے امریکی صدر کو آزادی کشمیر اور فلاح انسانیت کے لیے سرگرم شخصیات کی زبان بندی اور اسیری کی سلامی پیش کی گئی ہے۔ دوسری جانب ہندوستان کی مودی سرکار کو خوش کرنے کے لئے ارض پاکستان میں بھارتی فلموں کی نمائش پر عائد پابندی ختم کر دی گئی ہے۔ گویا بغیر کسی مطالبے کے لیے جی حضوری شروع کر دی گئی ہے۔ حافظ سعید صاحب ایک شخصیت کا نام نہیں بلکہ شاید اب وہ ایک نظریے اور سوچ کی علامت بن چکے ہیں۔ وہ اب خاموش بھی رہیں گے تو ان کی آواز کشمیر کی برف پوش پہاڑیوں پر، سندھ کے صحرائی علاقوں میں ان کے لئے احتجاج کرتے ہندوؤں اور ملک بھر میں فلاح انسانیت کے لئے سرگرم کارکنوں کی زبان سے سنی جا سکتی ہے۔ ان کی نظر بندی جماعت الدعوہ کے کارکنان کے لئے کوئی نئی بات نہیں وہ ان حالات سے نمٹنے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یوم یکجہتی کشمیر سے چند روز قبل آزادئ کشمیر کے لئے سرگرم سب سے بڑی آواز کو خاموش کر کے کس کی خدمت کی گئی ہے؟ سوال تو یہ بھی ہے کہ بغیر مطالبے کے امریکی صدر کے ڈر سے جو اقدامات اٹھائے گئے ہیں تو آنے والے دنوں میں مزید کیا گل کھلانے کا ارادہ ہے۔ عالمی سیاست میں ریاستوں کو بعض مشکل فیصلے بھی کرنے پڑتے ہیں لیکن شاید ہی کبھی کسی نے ایک ایسا قدم اٹھانے میں اتنی جلدی کی ہو کہ جس کی ڈیمانڈ تک نہ سامنے آئی ہو۔ امریکی ’’ڈومور‘‘ پالیسی کی غلامی کی اس سے بدترین مثال نہیں ملے گی۔ ایسا لگتا ہے ڈونلڈ ٹرمپ کے آتے ہی اسلام پسندوں کی آواز دبانے اور اسلام مخالف سرگرم قوتوں کو تقویت ملی ہے اور ہر طرف ایک ہیجان کی کیفیت ہے۔ سیکولر طبقے توہین اسلام کے مرتکب ’’بلاگرز‘‘ کی گمشدگی کو چند دن بھی برداشت نہ کر سکے اور انہیں بزور طاقت بازیاب کرا کے ’’محفوظ ٹھکانوں‘‘ تک پہنچا دیا گیا ہے۔ اب مسلمانوں کی مظلومیت کے لئے بولنے والے اور اسلام کی بات کرنے والوں کی زبان بندی اور نظر بندی کے بندوبست کیے جا رہے ہیں۔ اہل پاکستان کو مبارک ہو کہ ان کی تفریح کے لئے ’’بھارتی فلمیں‘‘ اب دستیاب ہوں گی لیکن اسلام کو دیوار سے لگانے والوں کی نظر ایک شعر کرنا چاہوں گا جسے وقت نے ثابت بھی کیا ہے اور ہم سب کا ایمان بھی ہے ؎

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

فہم قرآن　　ابوحمزہ عبدالحمید المری*

مبہمات القرآن

علوم قرآنی کی جہات تو متعدد ہیں، مثلاً: غریب القرآن، اعراب القرآن وغیرہ۔ لیکن جس علم کا ذکر یہ بندہ عاجز کر رہا ہے اس کی طرف متاخرین نے کم اور متقدمین نے کافی توجہ دی ہے اور اسے ذوق وشوق سے حاصل بھی کیا اور اسے بہت پھیلایا بھی ہے۔ یہ قرآنی مبہمات کا علم ہے۔ اگرچہ عربی زبان میں تو اس کا وافر حصہ موجود ہے لیکن اردو میں اس فن کی کوئی علیحدہ اور مستقل کتاب نظر سے نہیں گزری حتیٰ کہ اس موضوع پر ایک مختصر حاشیہ قرآنی بھی نظر نہیں آیا۔ لہٰذا اس بات کے پیش نظر راقم نے ایک مختصر حاشیہ قرآن مکمل کیا ہے، بندہ وہ اس میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے، یہ بات اس حاشیے کے طبع ہونے پر اور علمائے کرام کے مطالعے کے بعد ہی معلوم ہو سکے گی۔ نیز اس کی مفصل تفسیر پر بھی کام جاری ہے تا کہ اردو زبان اس مبارک علم سے محروم نہ رہے جس کا نام ''حسن البیان فی تفسیر مبہمات القرآن'' تجویز کیا ہے۔

مبہم کے لغوی معنی: ایسی بات یا ایسا جملہ جس کا مطلب ومعنی بذات خود معلوم نہ ہو بلکہ اس کے لیے جستجو کرنی پڑے۔

اصطلاحی معنی: قرآن کریم میں ایسی آیت یا الفاظ جن کا مطلب بظاہر معلوم نہ ہو اور اس کی وضاحت کرنی مقصد ہو، مثلاً:

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖۤ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۝۳۳ [الزمر: ۳۳]

یہ علم صرف کتاب وسنت اور اقوال صحابہ اور تابعین وغیرہ ثقاۃ اہل علم سے حاصل کیا جاتا ہے بشرطیکہ صحیح سند سے ثابت ہو، اس میں رائے وقیاس کا کوئی دخل نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی وضاحت صحابہ کرام کو بتا دی۔ انھوں نے اسے صرف محفوظ ہی نہیں رکھا بلکہ ایک دوسرے سے حاصل کرنے کی سعی مشکور بھی کی اور پھر اسے اپنے شاگردوں تک پہنچانے کا بھی اہتمام کیا۔

یہ فطری بات ہے کہ علم دوست انسان نادر علوم کے حصول کا شائق اور ان کی طرف مائل رہتا

*abuhamzah.abdulhameed@gmail.com

ہے۔اسی طرح وہ نامعلوم کو معلوم کرنے کا شائق بھی ہوتا ہے کیونکہ اس کی فطرت ہی میں تجسس کا مادہ ہوتا ہے۔اہل ادب اُس نامعلوم شاعر کا نام جاننے کی کوشش کرتے ہیں جس کا شعر انھیں داد دینے پر مجبور کردے، جبکہ معلوم ہونے پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں، گویا گوہر نایاب ہاتھ آ گیا ہو۔ جب اہل ادب کی یہ حالت ہے تو کیا قرآن کریم کے مبہم کا علم ہونے کی خوشی نہیں ہوگی کیونکہ یہ علم بھی قرآن کی تفسیر کا علم ہے اور خدمت قرآن کا حصہ بھی۔

حضرات صحابہ کرامؓ نے اس علم کی بنیاد رکھی اور اس کے حصول کی پوری کوشش کی تاکہ علم تفسیر کا یہ شعبہ بھی محفوظ ہوجائے۔ نیز انھوں نے اس علم کو آگے بھی پھیلایا اس کو مدوّن بھی کیا یہاں تک کہ یہ علم تابعین سے ہوتا ہوا ہم تک آ پہنچا اور آج ہم اس سے مستفید ہورہے ہیں۔

مبہمات قرآن وحدیث کا علم بھی اس کی تفسیر کا ایک لازمی حصہ ہے کہ اس کے بغیر قرآن و حدیث کو سمجھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔سلف صالحین بھی اس علم کے حصول میں کوشاں رہے اور اس کو مزید منقح کیا چنانچہ حضرت عکرمہؓ کہتے ہیں کہ مجھے آیت nbMk y) Yj tk yD مُهَاجِرًا [النساء:۱۰۰] میں مذکور کا نام چودہ سال انتظار کے بعد حاصل ہوا۔ یہ واضح دلیل ہے کہ سلف صالحین نے اس کی تفسیر وتفصیل کی فضیلت معلوم ہونے کے بعد اس کے حصول میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

اسی طرح حضرت ابن عباسؓ سے یہ بھی مروی ہے کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا راز افشا کرنے والی دو عورتوں کے نام معلوم کرنے میں پورا ایک سال انتظار کرتا رہا تب جا کر حضرت عمرؓ سے یہ گوہرِ مقصود حاصل ہوا۔(صحیح بخاری)

مندرجہ بالا وضاحت اس بات کی دلیل ہے کہ علمائے کرام نے اس علم کو پورے خلوص اور محنت سے حاصل کیا اور اس فن میں متعدد کتابیں بھی لکھیں کیونکہ یہ بھی علم تفسیر کا ایک حصہ ہے۔ چند ایک کے نام یہ ہیں: امام فراء، مجاہد، مقاتل، ابن جریر طبری، بغوی، ابن کثیر، ابن جوزی اور جلال الدین سیوطی وغیرہم۔علاوہ ازیں یہ علم کتب احادیث میں بھی بھرا پڑا ہے۔

قرآن میں مبہمات کا جواز

یہ بات ظاہر ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے وہ جس طرح چاہے اسے بیان کرسکتا ہے کہیں مفصل تو کہیں مختصر، کہیں مبہم تو کہیں مفسر لہٰذا علماء نے اس پر بھی خاصی خامہ فرسائی کی ہے۔

امام زرکشی لکھتے ہیں قرآن میں مبہمات کے اسباب درج ذیل ہیں:

۱۔ دوسری جگہ وضاحت کی وجہ سے یہاں مبہم ذکر کیا ہو مثلاً

(الف) [illegible] [الفاتحہ] یہاں ابہام ہے جبکہ دوسری جگہ وضاحت ہے: قول اللہ عزوجل: [illegible]

وَالصِّدِّيقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ [النساء:۶۹]

(ب) [illegible] [الفاتحہ] کی وضاحت آیت [illegible] لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا [الانفطار:۱۹] میں کردی ہے۔

۲۔ مبہم اس لیے کہ وہ بات یا نام مشہور و معروف تھا

(الف) [illegible] [البقرۃ:۳۵] ماسوا حضرت حواء اور حضرت آدم کے دوسرا کوئی تھا ہی نہیں۔

(ب) [illegible] [البقرۃ:۲۵۸] حضرت ابراہیم کی مخالفت کرنے والا نمرود ہی تو تھا!

۳۔ اس پر پردہ ڈالنے کے لیے ابہام سے کام لیا

(الف) [illegible] [البقرۃ:۲۰۴]

مراد اخنس بن شریق ہے اسے اس لیے مبہم ذکر کیا کہ وہ بعد میں مسلمان ہو گیا تھا اور مخلص مسلم بنا۔

(ب) [illegible] [البقرۃ:۱۰۸] سے مراد رافع بن حریملہ اور وہب بن زید تھا۔

۴۔ اس کی تعیین کا کوئی فائدہ نہیں

(الف) [illegible] [الاعراف:۱۶۳]

مراد ایلہ یا انطاکیہ ہے۔

(ب) [illegible] [یونس:۹۸] ایک بستی سے مراد نینوا کی بستی ہے۔

۵۔ وہ عام ہو سب کو معلوم ہو

(الف) [illegible] [النساء:۱۰۰] مراد ضمرہ بن عیص ہے۔

(ب) [illegible] [المائدۃ:۴] یہ عدی بن حاتم کے کتوں کے بارے نازل ہوئی لیکن یہ عام ہے خاص نہیں۔

۶۔ تعظیم کی وجہ سے مبہم ذکر کرنا

(الف) [illegible] [الزمر:۳۳] جَآءَ بِالصِّدۡقِ سے مراد حضرت محمد ﷺ اور وَصَدَّقَ بِهٖۤ سے مراد حضرت صدیق اکبر ہیں کہ دونوں درجہ بہ درجہ معظم و محترم ہیں۔

(ب) [illegible] [التوبۃ:۴۰] مراد حضرت صدیق اکبر ہیں۔

۷۔ تحقیر و تنقیص کے سبب مبہم ذکر کرنا

(الف) [illegible] [الحجرات:۶] مراد عقبہ بن ابی معیط ہے۔

(ب) [illegible] [الکوثر:۳] عاص بن وائل مراد ہیں۔

اسباب ابہام صرف سات پر منحصر نہیں بلکہ مزید بھی مستنبط ہو سکتے ہیں۔

ابہام کی صورتیں

① جن میں بحث کرنا جائز نہیں، بلکہ سابقہ اسباب کو سامنے رکھتے ہوئے سلف صالحین کے اقوال پر ہی اکتفا کر کے اس ابہام کو دور کرنا ہے۔

② جن میں توقف واجب ہے اور غور و خوض صحیح نہیں اور نہ ان کا معلوم کرنا روا ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے مخصوص کیا اور بیان بھی کر دیا ہے:

[illegible] [لقمان:۳۴]

مراد علم الاعیان ہے نہ کہ علم الاجناس۔

علم اللہ میں مبہم کی تلاش ناجائز ہے۔ دوسری مثال:

وَاٰخَرِيۡنَ مِنۡ دُوۡنِهِمۡ ۚ لَا تَعۡلَمُوۡنَهُمۡ ۚ اَللّٰهُ يَعۡلَمُهُمۡ [الانفال:۶۰]

اس شخص کی جرأت پر حیرت ہوتی ہے کہ اس نے اس سے قریظہ یا جنوں میں سے مراد لیا ہے۔ (قالہ الزرکشی)

بندہ عاجز کہتا ہے کہ اس آیت میں یہ کہیں نہیں کہ اس سے مراد جنس نہیں ہے۔ اس سے مراد

تعیین ہے جوکہ قریظہ کی تعیین کی نفی نہیں۔اس کی نظیر منافقین کے بارے میں یہ فرمان ہے:

وَ مِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ وَ مِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ[التوبۃ:۱۰۱]

یہاں صرف علم الاعیان کی نفی ہے اور یہ قول کہ وہ قریظہ ہی تھے روایات سے ثابت ہے لہٰذا اسے جرأت علی اللہ نہیں کہا جاسکتا ہاں یہ بات الگ ہے کہ امام زرکشی کو ان دونوں روایات کا علم نہیں ہوسکا۔

یہیں سے معلوم ہوا کہ تفسیر مبہمات میں رائے کو دخل نہیں بلکہ یہ ایسا فن ہے جسے قابل اعتماد مصادر سے بیان کیا جائے۔ہاں،اس موضوع کے جمع وتدوین میں جائز ذرائع اجتہاد کی کوشش کی جاسکتی ہے ماسوی علم اللہ تعالیٰ کے،اسی طرح مزید اسباب ابہام کو سابقہ مذکورہ اساس پر اجتہاد سے تلاش کیا جاسکتا ہے۔

علم مبہمات کی تکمیل

اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ علم مکمل ہو چکا ہے جیسا کہ امام زرکشی وسیوطی نے اپنی کتب میں ذکر کیا ہے۔ہاں ترتیب وشمار میں علماء کی اصطلاحات کے اختلاف کی وجہ سے اختلاف واقع ہوا ہے تو کیا یہ علم اور اس کی تفسیر بذاتہ علم ہے اس کی شروط علم واستقلال اس کی تکمیل کرتی ہیں؟ حقیقتاً اس کا جواب اگلے دس اصول کو سامنے رکھ کر دیا جاسکتا ہے۔

① تعریف ② موضوع ③ واضع ④ مراجع ⑤ نام ⑥ حکم ⑦ مسائل ⑧ نسبت ⑨ فائدہ ⑩ غرض وغایت

تو کیا مذکورہ دس اصول قرآنی علم المبہمات میں موجود ہیں اور ان کی تطبیق کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے یہ علم قائم بذاتہ ہے اور ان کا تعلق علم المبہمات سے ہے؟

۱۔تعریف: ایسا تفسیری دراسہ جو آیات قرآن کو متناول ہو کہ جس میں تعداد، وقت، نام و نسب وغیرہ مذکور ہوں جسے قابل اعتماد مراجع سے حاصل کیا گیا ہو۔

۲۔موضوع: آیات قرآنیہ جن میں یہ معلوم ہو کہ مبہمات کی تعداد کیا ہے اور غیر مذکور کی تعداد کتنی ہے۔الفاظ (مثلاً الناس، مؤمنین) کے معانی جب یہ کسی مخصوص قوم کے لیے وارد

ہوئے ہوں، ان آیات میں نام، صفات لقب، کنیت اور مشہور انبیاء کے انساب نیز بادشاہوں وغیرہ کی تفصیل بیان کی جائے۔

۳۔ واضع: اس علم کے وضع کرنے والے اس امت کے انتہائی قابل اعتماد افراد صحابہ و تابعین اور قابل اعتماد نقل در نقل بیان کرنے والے اصحاب ہیں۔

۴۔ مراجع و مصادر: کتاب اللہ، حدیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قابل اعتماد اقوال۔

۵۔ نام: قرآن مجید کے مبہمات کا علم اور اس کی تفسیر

۶۔ حکم: وجوب کفائی کہ تمام لوگوں پر اس کا حصول لازم نہیں۔

۷۔ مسائل: قرآن میں مبہمات کی تلاش مثلاً تعداد، وقت، نام ونسب وغیرہ جتنی بھی ابہام کی صورتیں اوران کے اسباب ہیں ان میں غور وفکر کرنا۔

۸۔ نسبت: یہ علوم شرعیہ میں سے افضل علم ہے کیونکہ اس میں کتاب اللہ کے حوالے سے بحث و تمحیص ماثور طریقے سے کی جاتی ہے، یہی نہیں بلکہ ثقاۃ امت کے واسطے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تلاش کرنا بہ نسبت عام تفسیر کے زیادہ افضل ہے۔

۹۔ فائدہ: قرآن کے مبہمات سے لاعلم رہنے سے بچ جانا اور جو اقوال وآثار اس بارے میں منقول ہیں انھیں معلوم کرنا نیز مبہمات کے اسباب اور اس کی صورتیں بیان کرنا اور اور کس طریقے سے تلاش جائز اور کس طریقے سے ناجائز ہے۔

۱۰۔ غرض وغایت: فوز وفلاح دارین، دنیا میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کی تعمیل کرنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طلب علم کی ترغیب فرمائی ہے اور آخرت میں دونوں کی اطاعت کر کے حصول جنت کی کوشش کرنا۔

اس تمام بحث سے معلوم ہوا کہ مذکورہ تمام اصول وضوابط، قواعد وقوانین قرآن کے علم المبہمات پر پوری طرح منطبق ہوتے ہیں لہٰذا ہمیں یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ یہ علم باقی علوم تفسیر سے اشرف واکرم نہیں تو کم بھی نہیں ہے۔

تفہیم دین

ڈاکٹر محمد امین

اقامتِ دین کا صحیح تصور

اجتہاد کیا جا سکتا ہے لیکن دین کی نئی تعبیر نہیں کی جا سکتی

ایک اصولی بحث

قرآن وسنت سب مسلمانوں کے نزدیک دین اسلام کا بنیادی ماخذ ہیں[۱] اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نازل کردہ کتاب قرآن حکیم میں جو فرمادیا ہے وہ مقدس، حتمی اور ناقابل تغیر ہے۔ اسی طرح یقینی ذرائع سے اگر ہمیں پتہ چل جائے کہ اللہ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے اور مسلمانوں کو اس پر عمل کا حکم دیا ہے تو وہ بھی مقدس، حتمی اور ناقابل تغیر ہے۔ یعنی جہاں تک نصوص ومتون قرآن وسنت کا تعلق ہے، ان کے اتباع پر امت متفق ہے۔ لیکن مسئلہ یا اختلاف پیدا ہوتا ہے قرآن وسنت کی نصوص کے فہم میں یعنی قرآن حکیم کی کسی آیت یا نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کسی حدیث کا مفہوم ومطلب کیا ہے؟

اس سلسلے میں سب سے زیادہ اہم علم ہے صحابہ کرامؓ کا جن کی تربیت خود اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کی اور جنہوں نے قرآن نازل ہوتے ہوئے دیکھا اور اللہ کے رسول کو اس دین پر عمل کرتے اور کراتے ہوئے دیکھا۔ تو صحابہ کرامؓ اگر دین کے کسی معاملے یا قرآن وسنت کی کسی نص یا متن کے مفہوم پر متفق ہوں تو شرعی اصطلاح میں یہ صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے اور یہ حجت ہے۔ مطلب یہ کہ اس کے صحیح ہونے کے بارے میں مطمئن ہو کر ہمیں اس پر عمل کرنا چاہیے۔ اسی طرح اگر کسی معاملے یا مسئلے میں صحابہ کرامؓ کی اکثریت یعنی جمہور صحابہؓ کی کوئی رائے ہم تک پہنچے تو وہ بھی قابل اطمینان حد تک صحیح ہوگی اور اگر کسی معاملے یا قرآن وسنت کی کسی نص یا متن کے فہم کے بارے میں صحابہ کرامؓ کا اختلاف ہو تو ان میں سے کسی ایک کی رائے پر عمل کیا جائے گا اور سب کو ٹھکرانا غلط ہوگا۔ یہ منہج ہے اکثر اہل علم کا اور خصوصاً حضرت امام ابوحنیفہؒ کا جن کے علم وفہم اور فقاہت کو امت کا سوادِ اعظم تسلیم کرتا اور انہیں اپنا امام اور رہبر مانتا ہے۔ اور صحابہ کرامؓ کا علم چونکہ ہم تک ان کے شاگردوں (تابعین) کے ذریعے پہنچا ہے اس لیے تابعین کے علم کی بھی تقریباً وہی اہمیت ہے جو صحابہ کرامؓ کے علم کی ہے۔

---

[۱] باستثناء چند معتزلہ قدیم، یونانی تہذیب کے زیر اثر اور بعض معتزلہ جدید، مغربی فکر وتہذیب کے زیر اثر

اس کے بعد فہم دین میں اس بات کی اہمیت ہے کہ پچھلے چودہ سو سال میں اس امت کے جلیل القدر مفسرین، محدثین، فقہاء، صلحاء اور علماء نے اسے کس طرح سمجھا ہے اور قرآن وسنت کے کسی مسئلے یا ان کی کسی نص یا متن کا کیا مفہوم سمجھا ہے۔ اگر وہ کسی بات پر متفق نظر آئیں (یعنی ان کا اس پر اجماع ہو) تو اس بات کا اقرب الی الصواب ہونا یقینی ہے۔ اگر وہ ان میں سے اکثریت کی رائے ہو یعنی جمہور مفسرین، محدثین، فقہاء کسی نص کے فہم پر متفق ہوں تو وہ بھی اقرب الی الصواب ہوگی۔ اسی بات کا اطلاق پوری امت پر بھی ہوتا ہے کہ اگر صحابہ کرامؓ تابعینؒ اور پچھلی چودہ صدیوں کے مفسرین، محدثین، فقہاء، علماء، صلحاء کے فہم کی بناء پر امت نے کسی بات کو اپنا لیا ہے تو امت کا یہ تعامل بھی ایک طرح کی حجت ہے۔ امام مالکؒ اسی بناء پر عمل اہل مدینہ کو خبر واحد پر ترجیح دیتے تھے۔

ہماری اس بات کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کے نزول اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے چودہ سو سال بعد آج اگر دین کا کوئی عالم، فقیہ یا مجتہد اٹھ کر یہ کہے کہ دین کو جس طرح میں نے سمجھا ہے آج تک کسی نے نہیں سمجھا یا وہ دین کے مفہوم، مقاصد، مآخذ اور نصب العین کے حوالے سے کوئی ایسا موقف پیش کرے جو نیا ہو اور صحابہ کرامؓ، تابعین اور مجتہدین امت کے اجماع یا ان کی اکثریتی رائے سے مختلف اور متضاد ہو تو اسے رد کر دیا جائے گا اور قبول نہیں کیا جائے گا کیونکہ یہ دین آج نازل نہیں ہوا کہ کوئی لغت کی کتابیں کھول کر بیٹھ جائے یا اپنی فطانت سے دلائل تراشنا شروع کر دے کہ اس دین کا مطلب یہ اور یہ ہے اور اس کا نصب العین فلاں اور فلاں ہے۔ نہیں! اس دین کو صحابہ کرامؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سمجھا ہے اور اپنے شاگردوں کے ذریعے اس فہم کو امت تک پہنچایا ہے۔ پچھلے چودہ سو سال میں امت کے ہزاروں نہیں لاکھوں کروڑوں ذہین ترین اور متقی ترین افراد (مفسرین، محدثین، فقہاء اور مجتہدین) نے اس دین کو سمجھنے سمجھانے میں عمریں صَرف کی ہیں لہٰذا آج اگر کوئی دین کی ایسی تعبیر کرتا ہے جو پہلوں سے اور خصوصاً صحابہ کرام سے مختلف اور متضاد ہو تو اسے قبول نہیں کیا جا سکتا اور نہیں کیا جانا چاہیے۔ یہ حکم شرعی بھی ہے[۱] اور عقلی تقاضا بھی۔

---

[۱] اس پر بھی تفصیل سے گفتگو قرآن وسنت اور علماء ومجتہدین کے ہاں موجود ہے۔ صحابہ کرامؓ کے فہم دین کی حجت کے لیے دیکھیے قول سبحانہ وتعالیٰ [illegible] [التوبہ ۹:۱۰۰] اور قول النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم [illegible] [موطا امام مالک] اور [illegible] اور قول ابن مسعودؓ [illegible]
تفصیل کے لیے دیکھیے علامہ حامد کمال الدین کی تالیف ’’فہم دین کا مصدر‘‘ اور مناقب صحابہ پر لکھی گئی کتب۔

اس موقف پر اعتراضات کا جائزہ

اس موقف پر ایک اعتراض یہ ہوسکتا ہے کہ یہ تو تقلید اور جمود پر اصرار ہے اور اگر یہ صحیح ہے تو پھر اجتہاد کا کیا مطلب و مقصد ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ اجتہاد کا دروازہ قیادت تک کھلا ہے۔ اجتہاد ہونا چاہیے اور ضرور ہونا چاہیے اور جو اجتہاد کے اہل ہیں انہیں ضرور اجتہاد کرنا چاہیے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اجتہاد کی حدود اور اس کا دائرہ کار کیا ہے؟

اجتہاد کا دائرہ کار حوادث و نوازل ہیں یعنی نو پیش آمدہ امور اور نئے مسائل جن کے بارے میں حکم شرعی صراحتاً دین کے بنیادی مآخذ قرآن و سنت میں موجود نہ ہو۔ اصول فقہ کی رو سے اور قانوناً و اصطلاحاً اجتہاد اسی کو کہتے ہیں۔ تاہم اگر اجتہاد کو وسیع تر معنوں میں استعمال کیا جائے تو اس کا اطلاق مندرجہ ذیل امور پر بھی کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ معاملات کے وہ تمام پہلو جہاں شارع نے اپنی حکمت بالغہ کے تحت اور لوگوں کی آسانی اور بھلائی کے لیے تفصیلی احکام نہیں دیے اور امت (کے علماء و مجتہدین) پر چھوڑ دیا کہ وہ اپنی ضرورت اور حالات کے مطابق تفصیلات خود مدون کرلیں جیسے معاشی، سیاسی، تعلیمی، عدالتی ....نظام۔ گویا اس میں تمام سماجی و عمرانی علوم شامل ہیں۔

۲۔ قرآن و سنت کے کسی جزیے کے فہم میں اجتہادی رائے قائم کرنا۔

اور اجتہاد سے ہماری مراد اجتہاد ہی ہے۔ ہم اپنے ہم نام جلیل القدر عالم اور فقیہ محمد امین المعروف بابن عابدین شامی کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے جس میں انہوں نے اجتہاد کو کئی اقسام میں شمار کیا ہے یعنی اجتہاد مطلق، اجتہاد فی المذہب، اصحاب ترجیح وغیرہ ....تاہم یہ ایک مستقل بحث ہے اور اس پر تفصیلی گفتگو پھر کبھی بشرطِ زندگی و فرصت۔

خلاصہ یہ کہ حوادث و نوازل، متون قرآن و سنت کے کسی جزیے کے فہم یا معاملات دنیوی کے جن پہلوؤں میں شارع نے تفصیل احکام نہیں دیے وہاں اجتہاد ہوسکتا ہے لیکن دین کے بنیادی ڈھانچے یعنی دین کے مفہوم، مقاصد اور نصب العین میں اگر کوئی اجتہاد کرے اور دین کی نئی تعبیر پیش کرے تو وہ قابل قبول نہیں ہوسکتی۔

اگر کوئی کہے کہ آپ کا یہ موقف آزادیٔ رائے اور حریت فکر کے خلاف ہے تو ہم عرض کریں گے کہ رائے اور سوچ کی مطلق آزادی تو حربۂ ابلیس ہے۔ اقبال کے الفاظ میں ''آزادیٔ افکار ہے

ابلیس کی ایجاد''حقیقت یہ ہے کہ آزادی ہمیشہ مشروط اور محدود ہوتی ہے جیسا کہ مشہور مقولہ ہے کہ ''جہاں سے میری ناک شروع ہوتی ہے وہاں سے آپ کی چھڑی گھمانے کی آزادی ختم ہوجاتی ہے'' لہٰذا حریت فکر اور آزادئ اظہار رائے کے نام پر ہم کسی کو اپنے دین اور اس کے بنیادی ڈھانچے کو بدلنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔مغرب میں بھی ایسا ہی ہے۔ وہاں کوئی آئین، جمہوریت، شخصی آزادی، نظام سرمایہ داری یہاں تک کہ ہولوکاسٹ کے خلاف کوئی بات توکرکے دیکھے! نہ معاشرہ اسے برداشت کرے گا اور نہ ریاست۔دنیا بھر میں اعلیٰ عدالتوں کا فیصلہ بھی یہی ہے چنانچہ پچھلے دنوں پاکستان کی سپریم کورٹ نے بھی یہی فیصلہ دیا ہے کہ پارلیمنٹ بلاشبہ بالادست ہے اور جو قانون وہ چاہے بنا سکتی ہے لیکن آئین کے بنیادی ڈھانچے کو وہ نہیں چھیڑسکتی۔

یہی وجہ ہے کہ اگرچہ قرآن وسنت کے متن کے کسی جزیے کی تشریح میں اختلاف ہوسکتا ہے لیکن اگر یہ اختلافِ رائے دین کے بنیادی ڈھانچے کو متزلزل کرنے والا ہوتو اسے بھی رد کردیا جاتا ہے جیسے مثلاً مرزا غلام احمد قادیانی کی قرآنی الفاظ خاتم النبیین کی ایسی تشریح امت اور اس کے اہل علم نے رد کردی جو دین کے بنیادی ڈھانچے کو متاثر کرتی تھی اور نبوت کے جاری رہنے کی بات کرتی تھی چنانچہ سب علماء اور امت نے بحیثیت مجموعی اس کی تکفیر کی اور اسے اور اس کے متبعین کو غیر مسلم قرار دیا۔

یہ بھی واضح رہے کہ اجتہاد خواہ وہ حوادث ونوازل میں ہو، خواہ معاملات اور عمرانی علوم میں اور خواہ قرآن وسنت کے متون کے کسی جزیے میں، اس کے قابل قبول ہونے کی دو شرطیں ہیں:

ایک: یہ کہ اجتہاد کرنے والا اس کا اہل ہو یعنی وہ علوم قرآن وسنت کا شناور ہو، عربی زبان کا ماہر ہو، ملکۂ اجتہا د رکھتا ہو، سابقہ اجتہادات سے واقف ہو، زیر بحث مسئلے کو سمجھتا ہو اور متقی ہو۔

دوم: دین کے ساتھ مخلص اور حنیف (یکسو) ہو۔مسلم معاشرے کو درپیش مسائل کا حال اسلامی تناظر ہی میں اس کے پیش نظر ہو اور اس کی چشم بصیرت ماسوا اسلام اور کسی غیر اسلامی فکر وتہذیب سے خیرہ نہ ہو چکی ہو۔اقبال نے مرزا غلام احمد قادیانی کے الہامات (دعویٰ نبوت، تنسیخ جہاد، حمایت برطانوی استعمار وغیرہ) کو اسی بناء پر رد کردیا کہ ان کا منبع اسلام کی خالص فکر نہ تھی بلکہ وہ ایک ''غلام'' شخص کے ''ذہنی افلاس'' کے عکاس تھے۔اور برصغیر میں جمہور علماء اور

امت نے سرسید، امیر علی، چکڑالوی، احمد الدین امرتسری، غلام احمد پرویز، غلام جیلانی برق اور عصر حاضر میں جاوید احمد غامدی وغیرہ کے مذہبی افکار کو اس لیے رد کر دیا ہے کہ وہ خالص اسلام پہ یکسو نہیں بلکہ ان کی آنکھیں مغرب کی الحادی فکر وتہذیب سے خیرہ ہو چکی ہیں اور وہ اس کی روشنی میں اجتہاد کر کے اسلامی تعلیمات کو ان کے مطالبات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ نئے مسائل، معاملات وعمرانی علوم کی تفصیلات وضع کرنے کے لیے اور قرآن وسنت کے کسی جزیے کی تفہیم کے لیے نیا اجتہاد کیا جا سکتا ہے لیکن اجتہاد کے نام پر کسی کو دین کے بنیادی ڈھانچے یعنی اس کے مفہوم، مقاصد اور نصب العین کی تعبیر نو کی اجازت نہیں دی جا سکتی اور نہ اسے قبول کیا جا سکتا ہے۔

اس بنیادی اصول کی روشنی میں اب ہم اقامتِ دین کے تصور پر گفتگو کریں گے۔ (جاری ہے)

الکمال للّٰہ [اعتذار]

البرہان کے شمارہ جنوری فروری ۲۰۱۷ء کے شذرات میں لفظ 'مودی' کی جگہ کمپوزر نے 'مودودی' کمپوز کر دیا اور پروف ریڈنگ کے وقت یہ غلطی پکڑی نہ جا سکی۔

شمارہ دسمبر ۲۰۱۶ء میں پروفیسر طارق بٹ صاحب کے مضمون میں اکوڑہ خٹک کے مولانا محمد اسرار مدنی صاحب کی ولدیت غلط منسوب ہوگئی۔ اسی مضمون کے بارے میں انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز نے شکوہ کیا کہ ان کے بارے میں لکھے جانے سے پہلے ان کا موقف معلوم کرنا چاہیے تھا اور یہ کہ اظہر صاحب ان کے سابقہ ملازم نہیں ہیں۔ اس بے احتیاطی سے جن لوگوں کی دل آزاری ہوئی ہم ان سے معذرت خواہ ہیں اور آئندہ مزید احتیاط کی جائے گی۔

تاہم ادارہ اپنے اس موقف پر قائم ہے کہ امریکہ ویورپ کو اپنے مذموم مفادات کے لیے اصلاح کے نام پر دینی مدارس میں مداخلت کا کوئی حق نہیں اور جو پاکستانی افراد اور ادارے ان سے پیسے لے کر یہ کام کر رہے ہیں وہ بھی صحیح نہیں کر رہے۔ دینی مدارس کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنی اصلاح خود کریں اور دوسروں کو اپنے امور میں مداخلت کا موقع نہ دیں۔ (مدیر)

غلبہ دین

محمد مشتاق ربانی

غلبۂ دین کے تقاضے

ہم میں سے کئی لوگ غلبۂ دین اور اسلامی انقلاب کی بات کرتے ہیں لیکن جو ہماری اخلاقی حالت ہے اس میں اسلامی انقلاب سے پہلے بہت سے امور میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس میں سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ ہمارے رویے درست ہو جائیں۔ اخلاقی قدریں ہم کھو چکے ہیں۔ مثبت سماجی رویے ہم بھول چکے ہیں۔ معمولی بات پر ہم ایک دوسرے کا گریبان پکڑ لیتے ہیں۔ عوام الناس کی تربیت کا کوئی انتظام ہی نہیں۔ ہم اپنے معاشرے میں جب بعض واقعات دیکھتے ہیں تو لگتا ہے کہ شاید زمانۂ جاہلیت میں بھی ایسے واقعات کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم اسلام اور ایمان سے عاری ہو چکے ہیں جب کہ اسلام نام ہی رویے کی درستی اور اچھے اخلاق کا ہے۔ کلمہ طیبہ پر عمل ہی سے ہی درست رویے تشکیل پاتے ہیں۔ سورۃ ابراہیم میں کلمہ طیبہ کو ایک درخت سے تشبیہ دی گئی ہے جس کی جڑ بہت مضبوط ہے اور اس کی شاخیں آسمان تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ پھیلاؤ دراصل کلمہ طیبہ یعنی توحید کے اثرات ہیں۔ ان اثرات میں اچھے رویے بھی شامل ہیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ خطبہ حجۃ الوداع میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسروں کو ایذا رسانی سے منع فرمایا تھا۔

یورپ میں جو اسلام فوبیا پایا جاتا ہے وہ زیادہ تر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ ہے لیکن اس میں یقینا کچھ نہ کچھ عمل دخل خود مسلمانوں کے رویے کا بھی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اخلاق کی درستی کے لیے تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کا تزکیہ کیا۔ قرآن مجید میں ایک سے زائد مرتبہ "]b,i[" کا لفظ آیا ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کا تزکیہ کرتے تھے۔ یہ اس لیے تھا کہ جب انہیں احکام الٰہی ملیں تو وہ ان پر گراں نہ گزریں بلکہ وہ پوری آمادگی کے ساتھ ان احکامات پر عمل کریں۔ یہی وجہ تھی کہ شراب نوشی اس معاشرے میں پوری طرح سرایت کیے ہوئے تھی لیکن جب شراب نوشی کی حرمت آئی تو وہ اس کو ترک کرنے کے لیے فوراً آمادہ ہو گئے۔ اسی تزکیہ نفس کی بدولت وہ مصائب سے نہیں گھبراتے تھے۔ صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں

ایسے سخت حالات بھی آئے کہ ان کو پڑھتے ہوئے ایک انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن وہ ان کو اخروی کامیابی کے لیے جھیلتے تھے۔ان کا یہ تزکیہ نفس صحبت نبویہ کا نتیجہ تھا۔

ہمیں بھی اصلاح نفس کی ضرورت ہے جو قرآن مجید اور صحیح احادیث نبویہ سے ممکن ہے۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات تزکیہ نفس کے لیے مؤثر کردار ادا کرسکتی ہیں۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں کس کس مسئلہ پر زیادہ توجہ دینی چاہیے؟ ایک تو ہمیں فرقہ واریت سے نکلنا چاہیے اور امت سے اپنا ناتا استوار کرنا چاہیے۔دوسرے ہمیں اپنے علم میں اضافہ کرنا چاہیے اور اس کے ساتھ اخلاقی اقدار کو بحال کرنا چاہیے۔ جتنے بھی سکالرز ہیں وہ سب اسلامی نظام کے قیام سے قبل افراد کی تربیت کو ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ عوام الناس کی تربیت اور تزکیہ کے بغیر کئی دوسرے مسائل جنم لے سکتے ہیں۔اللہ سبحانہ وتعالی کا ارشاد ہے pY pYpZ pYbZ p pYbZZ pZ EöDIÜSA"j D/äiAÿ DIZUi 6ä الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ﴿۲۲﴾۔ (سورۃ محمد: ۲۲) اس آیت مبارکہ کا مفہوم یہ ہے کہ اس حالت میں اگر تمہیں کسی جگہ کنٹرول دے دیا جائے تو اس کا نتیجہ فساد کی صورت میں نکلے گا اور تم صلہ رحمی کی بھی پروانہیں کرو گے۔صاحبِ تفہیم القرآن نے اس آیت کے دو مفہوم بیان کیے ہیں۔ ایک مفہوم اسلام سے اعراض کا نتیجہ بیان کیا ہے اور دوسرے کے بارے میں کہا ہے:''جب تمہاری سیرت وکردار کا حال یہ ہے کہ جس دین پر ایمان لانے کا تم نے اقرار کیا تھا اس کے لیے تمہارے اندر کوئی اخلاص اور کوئی وفاداری نہیں ہے، اور اس کی خاطر کوئی قربانی دینے کے لیے تم تیار نہیں ہو، تو اس اخلاقی حالت کے ساتھ اگر اللہ تعالی تمہیں اقتدار عطا کر دے اور دنیا کے معاملات کی باگیں تمہارے ہاتھ میں آجائیں تو تم سے ظلم وفساد اور برادر کشی کے سوا اور کس چیز کی توقع کی جاسکتی ہے؟''۔مولانا نے یہ جو مفہوم بیان کیا ہے اس کی گنجائش تو نکلتی ہے، کیونکہ فعل تولی اعراض کے معنی میں بھی ہے اور اقتدار حاصل کرنے کے مفہوم میں بھی۔ اس آیت کے مخاطب منافقین ہیں۔مولانا کے اقتباس کو میں نے اس لیے بیان کیا ہے کہ یہ ہمارے موضوع سے متعلق ہے۔انہوں نے جو مفہوم پیش کیا ہے اس سے قرآن مجید کے تفسیری مفہوم سے ہمارے مؤقف کو تقویت ملتی ہے۔امام رازیؒ (ت ۶۰۴ھ) نے بھی مذکورہ بالا دونوں مفہوم بیان کیے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ مولانا نے اس آیت کی تفسیر لکھتے ہوئے امام رازیؒ کی رائے سے استفادہ کیا ہو۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ زیادہ تر مفسرین نے یہاں اطاعت سے اعراض کرنے کا مفہوم لیا ہے۔

ہمارے ہاں مذہبی جذباتیت تو موجود ہے، لیکن رویوں میں نکھار نہیں ہے۔ جب ہم رویے کی درستی کی بات کرتے ہیں تو اس میں کئی باتیں شامل ہیں ۔ زبان کا درست استعمال، اختلاف رائے کو برداشت کرنے کی قوت، اشتعال انگیزی سے گریز، طبیعت میں ٹھہراؤ جیسے پہلو درست رویے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اسی طرح تزکیۂ نفس حقیقت میں حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ تزکیہ نفس دینی رجحانات کا نام ہے۔ اچھے رویے ایمان اور دین اسلام سے ہی وجود میں آتے ہیں۔ ایمان میں ہم جس قدر بہتر ہوں گے، رویوں میں بھی تبدیلی آئے گی ۔ یہ تبدیلی انتہا پسندی نہیں ہوگی بلکہ اس سے متوازن اور معتدل طرز عمل بنے گا۔ افراد میں اگر ایمان پیدا ہو جائے تو معاشرے میں سکھ کا سانس آئے گا۔ صحت مند سرگرمیاں پیدا ہوں گی ۔ اب حالت یہ ہے کہ معاشرے کے چلن سے ذرا ہٹ کر بات کریں تو ایک طوفان امڈ آتا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ لوگ تربیت کے مرحلے سے نہیں گزرے ہیں۔

اصلاح کے عمل کو بروئے کار لانے میں کئی عوامل کا کردار اہم ہے جن میں تعلیم، میڈیا اور منبر و محراب سرفہرست ہیں۔ ان کی وجہ سے لوگوں کی آراء بنتی اور بگڑتی ہیں۔ ۔ کئی ٹاک شوز دیکھ کر عوام کنفیوز ہو جاتے ہیں۔ فلم انڈسٹری اور ڈراموں سے ہم اپنی دینی روایات کھو رہے ہیں۔ اسی طرح تعلیم میں اسلام کی روح کا فقدان ہے۔ تعلیمی اداروں سے نکلنے والے طلبہ و طالبات بہت کم اسلام کے مفہوم سے واقفیت رکھتے ہیں۔ تعلیم میں یکسانیت کی بجائے ثنویت ہے۔ طلبہ کے سامنے تعلیم کے مقصد کے حوالے سے کوئی ہدف ہی نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ تعلیم اس وقت تزکیہ اور تربیت کے لیے بہترین معاون ہو سکتی ہے اگر اس کی اصلاح کی جائے اور اسے درست طریقے سے استعمال کیا جائے۔ اسی طرح اکثر علماء معاشرے کی اچھی تعمیر کر رہے ہیں لیکن بعض ایسے بھی ہیں جن پر اسلام کا متوازن تصور واضح نہیں اور وہ ایسے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں جن کی شاید کبھی معاشرے کو ضرورت ہی نہ پڑے۔ فرقہ وارایت کو فروغ دینے سے ان کا وجود برقرار ہے ورنہ علمی حوالے سے وہ بہت کمزور ہیں۔

ماضیٔ قریب میں کئی مرتبہ اسلام کے غلبہ کی کوشش کی گئی لیکن موثر ثابت نہ ہو سکی ۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ سوسائٹی کی تربیت کے لیے زیادہ کام نہیں کیا جا سکا۔ ہمارے ہاں کچھ جماعتیں غلبہ اسلام کی جدوجہد کے ساتھ اپنے کارکنان کی تربیت بھی کرتی ہیں۔ اس تربیت کا ہدف اپنے

کارکنان میں رضائے الٰہی ،صبر،توکل،قناعت اورانفاق فی سبیل اللہ کے اوصاف پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ان میں ذکرو اذکار،تسبیحات اور عبادات میں زیادہ انہماک بھی ہونا چاہیے۔ ان اوصاف سے متصف افراد ہی غیر اسلامی نظام کو بدلنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اگر ایک شخص ان اوصاف سے متصف ہے تو دراصل وہ تزکیۂ نفس کی شاہراہ پر گامزن ہے۔ جماعتوں کو اپنے کارکنان پر داروغہ نہیں بننا چاہیے بلکہ ترغیب وتشویق سے معاملات کو آگے بڑھانا چاہیے۔

بعض حلقوں میں بیعت کا جو سلسلہ جاری ہے اس کا مقصد بھی تربیت اور باطنی طہارت کے لیے معاونت کرنا ہے تا کہ فرد کسی نیک شخص سے روحانی طور پر منسلک ہوکر اپنی اصلاح کر لے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بیعت کے بغیر بھی تربیت اور اصلاح ذات کی منزلیں حاصل ہوسکتی ہیں، بیعت البتہ اس میں کچھ آسانی پیدا کر دیتی ہے۔ بیعت کے ہوتے ہوئے بھی اپنی اصلاح خود ہی کرنا ہوتی ہے۔ اگر ایک شخص کسی نیک آدمی سے بیعت ہے لیکن وہ اپنی اصلاح کی طرف متوجہ نہیں تو اس بیعت کا کوئی فائدہ نہیں۔ انسان کے اندر سے جب آواز اٹھتی ہے تو پھر اصلاح کے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ ہمیں اپنے اندروں کو مردہ نہیں ہونے دینا چاہیے۔ انسان کا باطن ہرا بھرا رہنا چاہیے۔ اس میں ایمان اور محبت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی فصل بونی چاہیے۔ اسی سے تزکیہ ہوگا اور اسی سے اچھی تربیت ہوگی۔

الحمد للہ

مدیر البرہان ڈاکٹر محمد امین صاحب کے قائم کردہ ادارے اگرچہ عوامی سطح تک نفوذ نہیں کر سکے اور نہ اصحاب خیر کو متوجہ کر سکے ہیں تاہم علمی اور تعلیمی حلقوں میں ڈاکٹر صاحب کی فکر اور کام کی پذیرائی ہورہی ہے۔ اس وقت پاکستان کی تین یونیورسٹیوں میں ڈاکٹر صاحب کی فکر اور تصانیف پر ایم فل کے مقالے لکھے جارہے ہیں۔ فللّٰہ الحمد وبتوفیقه وبعزته تتم الصالحات.

(ادارہ)

غلبہ دین ادارہ

پاکستان کا مخدوش اسلامی مستقبل ۔ اصلاحی تجاویز

گوجرانوالہ میں علماء کرام کے ساتھ ایک نشست

مدیر البرہان کی درخواست پر مولانا زاہد الراشدی صاحب نے ۳۰ جنوری ۲۰۱۷ء کی شام گوجرانوالہ کے علماء کرام کے ساتھ ان کی ایک نشست کا اہتمام کیا۔ لاہور سے علامہ محمد خلیل الرحمن قادری صاحب اور پروفیسر ڈاکٹر محمد علی صاحب بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ پاکستانی فرد، معاشرے اور ریاست پر جو اسلامی اثرات آج نظر آتے ہیں بلاشبہ وہ دینی عناصر اور علماء کرام کی جدوجہد کا نتیجہ ہیں جس پر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک تلخ اور ناقابل انکار حقیقت ہے کہ پاکستان آج جس اخلاقی بحران میں مبتلا ہے، لوگ دین سے دور ہورہے ہیں اور معاشرے پر مغرب کی لادین فکر و تہذیب غالب آتی جارہی ہے تو اس کا سبب بھی بعض بنیادی شعبوں میں دینی قوتوں اور علماء کرام کا غیر موثر ہوجانا ہے۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ علماء کرام خود اپنا احتساب کریں، اپنی ناکامیوں کا خود جائزہ لیں اور ایسا لائحہ عمل اختیار کریں کہ پاکستانی معاشرے میں لوگ دینی تعلیمات پر عمل کرنے لگیں، ان کی دنیا وآخرت سنور جائے اور ہر سطح پر اور ہر شعبے میں دین غالب آجائے۔ پھر انہوں نے ذرا تفصیل سے دینی جماعتوں اور اداروں کے کام کی بعض خامیوں خصوصاً مسلک پرستی اور عدم اتحاد کا ذکر کیا۔

علماء کرام نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ بلاشبہ معاشرے میں فساد اور بگاڑ بڑھ رہا ہے لیکن مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ علماء کرام کئی پہلوؤں سے مثبت کام کررہے ہیں اور ہم اپنے کاموں پر نظر ثانی کرنے کو بھی تیار ہیں۔ فرقہ واریت پہلے سے کم ہوئی ہے اور دینی عناصر میں باہم افہام وتفہیم میں اضافہ ہوا ہے۔ ملی یکجہتی کونسل اور ملی مجلس شرعی میں علماء کرام باہمی اتحاد کے لیے بھی کام کررہے ہیں۔ اکثر علماء کرام کا خیال تھا کہ اس طرح کی نشستیں تواتر کے ساتھ ہونی چاہئیں اور ان میں مشترکات کو جمع کرنے اور ان پر عمل کی منصوبہ بندی ہونی چاہیے اور اس مثبت پیغام کو دینی قوتوں کی نچلی سطح تک بھی پہنچانا چاہیے تاکہ اس کے بہتر نتائج سامنے آسکیں۔ اجلاس میں مولانا زاہد الراشدی اور دینی جماعتوں کے مقامی سربراہوں کے علاوہ مولانا محمد اعظم، مولانا گلزار احمد آزاد، مولانا سید احمد حسین زید، مولانا محمد احمد نورانی، مولانا محمد شاہنواز فاروقی، مولانا جواد محمود قاسمی، حافظ اکرام اللہ خاں، مولانا امجد محمود معاویہ، قاری محمد سلیم زاہد، حکیم محمد افضل جمال، مولانا انعام الرحمن کے علاوہ فضل الحق خاں ایڈووکیٹ، بزنس مین شیخ امتیاز حسین اور شبان ختم نبوت کے نعمان بابر نے بھی شرکت کی۔

اسلام اور مغرب　　　　ڈاکٹر محمد امین

مغربی جمہوریت ـ متبادل کیا ہے؟

علماء کے ۲۲ نکات اور قرار داد مقاصد پر نئے اجتہاد کے ہمارے مطالبے پر ردّ عمل

سوال: میں نے مذکورہ موضوع پر آپ کا مضمون (البرہان شمارہ دسمبر ۲۰۱۶ء) دلچسپی سے پڑھا ہے اور آپ کی بات میں وزن لگتا ہے لیکن آپ نے سوال اٹھا کر چھوڑ دیا اور اس کا جواب نہیں دیا۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ علماء مل بیٹھیں اور اس پر غور کریں۔ آپ نے سوال اٹھایا ہے تو آپ خود جواب دیں کہ اگر مغربی جمہوریت غلط اور بری ہے اور اس میں چند اسلامی باتیں داخل کرنے سے وہ اسلامی جمہوریت نہیں بن جاتی تو آپ کا فرض ہے کہ ہمیں بتائیں کہ پھر حقیقی اسلامی جمہوریت کیسی ہوتی ہے اور وہ کہاں پائی جاتی ہے؟ یا یوں کہیے کہ اگر موجودہ اسلامی جمہوریت غلط ہے تو پھر عملاً اس کا صحیح اسلامی متبادل کیا ہے؟

جواب

کیا اسلام متبادل سیاسی نظام دیتا ہے؟ آپ کا سوال پڑھ کر ہمیں اقبال کا شعر یاد آ گیا ؎

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

ہم پوچھتے ہیں کہ اگر ہمارے پاس مغربی جمہوریت کا متبادل نہیں ہے تو ہم کیوں کہتے ہیں کہ اسلام تا قیامت قابل عمل ہے؟ اس میں ہر سوال کا جواب اور ہر مسئلے کا حل موجود ہے؟ اور قرآن کیوں کہتا ہے کہ [illegible] (۱) اور [illegible] شَیْءٍ (۲) بلکہ ہمارے کہنہ دماغوں اور غلام ذہنوں کے لیے تو یہ حکم ہونا چاہیے تھا کہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ [سوائے سیاسی اور اجتماعی امور کے] اور یہ کہ ہم نے اس کتاب میں ہر چیز کھول کر بیان کر دی ہے [سوائے سیاسی اور اجتماعی امور کے]۔ نعوذ باللہ من ذٰلك

۲۔ علماء اسلام اور مجتہدین کو اسلام کے سیاسی نظام کی نوعیت بتانے کی ضرورت نہیں البتہ

---

(۱) البقرہ ۲:۲۰۸

(۲) الانعام ۶:۳۸

مستفسر اور قارئین کی اطلاع کے لیے ہم عرض کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نبوت ختم کرنے کا فیصلہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد آنے والے لوگوں کی رہنمائی کے لیے چار نکاتی پیکج دیا:

۱۔ قرآن حکیم کو محفوظ کرنے کی ذمہ داری خود لی۔[۱]

۲۔ قرآن وسنت اور اسلام کی مخاطب کوئی خاص قوم نہیں بلکہ قیامت تک آنے والے سارے زمان ومکان ہیں۔[۲]

۳۔ امت مسلمہ کو یہ دین دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری دی۔[۳]

۴۔ قابل تغیر اجتماعی امور میں قرآن حکیم نے صرف پالیسی امور تک محدود رہنے کا پراز حکمت اصول اپنایا اور امت (کے اہل علم ومجتہدین) کو اجتہاد کی اجازت دی تاکہ وہ ہر زمانے میں اپنی ضرورت اور حالات کے مطابق اپنا تفصیلی اجتماعی نظام (سیاسی نظام، معاشی نظام، تعلیمی نظام وغیرہ) وضع کرسکیں۔

ہم اس وقت چوتھے اصول پر بات کررہے ہیں اور ہمارا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے ہمیں کوئی تفصیلی 'سیاسی نظام' نہیں دیا بلکہ صرف بنیادی سیاسی تعلیمات دی ہیں۔ اس کی کچھ تفصیلی صورت آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مدینہ میں ریاست قائم کرکے مہیا فرمادی۔ امت کی سطح پر اس کا ایک بہترین ماڈل خلفائے راشدین نے اپنے عمل سے لوگوں کے سامنے رکھا۔ پھر امت نے اگلے بارہ سوسال تک دنیا کے ایک بڑے حصے پر حکومت کی تو اس کا ایک سیاسی نظام تھا، اسے سیاسی استحکام حاصل تھا ورنہ مستحکم سیاسی نظام کے بغیر تو کوئی قوم چند سال نہیں چل سکتی چہ جائیکہ مسلم امہ کی حکومت بارہ سوسال تک چلی۔

اسلام کے سیاسی نظام کی تشکیل میں رکاوٹیں

ہاں! اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ خلافت کے نام سے مسلمانوں کا قائم کردہ سیاسی

---

[۱] الحجر ۹:۱۵

[۲] سبا ۲۸:۳۴

[۳] آل عمران ۱۱۰:۳

نظام ختم کیوں ہوا، کیسے ہوا اور کس نے کیا؟ اور اگر کسی وجہ سے ختم ہو گیا تھا تو ہم نے اس کا دوبارہ احیاء کیوں نہیں کیا؟ مسلمانوں کو چاہیے تھا کہ اپنے سیاسی نظام (خلافت) کو بحال کریں اور ماضی کے تجربات کے پیش نظر اس میں کمی بیشی کر لیں تا کہ وہ آج کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ یا اگر وہ کسی وجہ سے خلافت کی اصطلاح استعمال نہ کرنا چاہیں تو اسے کوئی دوسرا نام دے لیں مثلاً شورائیت۔ اصل بات نام نہیں کام ہے اور وہ کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنا آزاد اور مستقل (انڈی پنڈنٹ) سیاسی نظام تشکیل دینا چاہیے کیونکہ اللہ ورسول نے انہیں کوئی متعین اور تفصیلی سیاسی نظام نہیں دیا اور آج کے علماء و مجتہدین کا کام یہ ہے کہ وہ قرآن وسنت کی روشنی میں، صحابہ کرام اور امت کے علماء و مجتہدین کے سابقہ اجتہادات اور اپنی عصری ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے اجتہاد کریں اور نیا تفصیلی سیاسی نظام تشکیل دیں۔

رکاوٹیں

لیکن اس میں رکاوٹ کیا ہے؟ ہماری رائے میں بنیادی رکاوٹیں تین ہیں:

ایک یہ زمینی حقیقت کہ مسلمان اور ان کی تہذیب اس وقت مغلوب ہے۔ مغرب کی لادین فکروتہذیب کے علم بردار ممالک دنیا پر غالب ہیں۔ انہوں نے ماضی میں مسلم ممالک کو کچلا، لوٹا، تباہ و برباد کیا، غلام بنایا ان کی وحدت ختم کر کے انہیں چھوٹے چھوٹے ممالک میں تقسیم کیا۔ اور ان کے قائم کردہ اجتماعی ڈھانچے (سیاسی، معاشی، تعلیمی، قانونی.... نظام) کو توڑا اور اپنا اجتماعی ڈھانچہ اپنی فکروتہذیب کے مطابق استوار کیا تا کہ مسلمان ہمیشہ ان کے غلام رہیں۔ اس کے نتیجے یہ استعمار مسلمانوں میں ایسے لوگ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا جو اس کے ذہنی وفکری غلام تھے، اگرچہ ان کے نام مسلمانوں جیسے تھے او وہ نمازیں پڑھتے اور روزے رکھتے تھے۔ استعمار نے عیاری یہ کی کہ اس نے دوسری جنگ عظیم کے بعد نوزائیدہ مسلم ممالک میں اقتدار ان لوگوں کے سپرد کیا جو اس کے ذہنی غلام تھے اور ان کی مدد سے انہوں نے پرامن طریقے سے مسلم معاشرے میں نفوذ اور اس پر کنٹرول جاری رکھا اور یہ آج تک جاری ہے۔ اکثر مسلمان ممالک میں اور خود پاکستان میں آج بھی ہمارا سیاسی، تعلیمی، معاشی، قانونی، عدالتی... نظام تقریباً وہی ہے جو استعمار نے وضع کیا تھا اور جو ہمیں انگریز سے ورثے میں ملا۔ نوآزاد مسلمان حکومتوں کا فرض تھا کہ وہ آپس میں متحد ہو جاتیں، اپنے معاشروں میں اسلامی فکروتہذیب کو غالب کرتیں اور اپنے اجتماعی

ڈھانچے کی اسلامی تناظر میں تشکیل نو کرتیں۔لیکن استعمار چونکہ اِس وقت بھی دنیا میں غالب ہے، مسلم معاشرے کے بالادست طبقے آج بھی اس کے فکری اور ذہنی غلام ہیں، اس لیے مغرب اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنے عزائم میں کامیاب ہے۔

اس سلسلے میں مغرب کی حکمت عملی کے دو نکات اہم معلوم ہوتے ہیں: ایک یہ کہ مسلمانوں کو متحد نہیں ہونے دینا اور اس کے لیے ''خلافت'' کا لفظ اور نظام بحال نہیں ہونے دینا بلکہ یہ بھی اسی سلسلے کا ایک نفسیاتی وسیاسی حربہ ہے کہ عراق وشام میں اس کے ظلم وزیادتی اور اس کی مدد سے ہونے والے شیعہ حکومتوں کے مظالم کے ردعمل میں سنی گروپ ابھرا اور ظلم وزیادتی کے ردعمل اور انتقام میں وہ بھی انتہا پسند ہو گیا۔ پھر امریکہ نے خفیہ طور پر اس انتہا پسند گروپ کی مدد اور حمایت کی اور اسے عراق وشام کے علاقے میں ''خلافت اسلامیہ عراق وشام'' (داعش) کی حکومت قائم کرنے میں مدد دی۔ یہ ''خلافت'' آج بھی قائم ہے اور خود پر ہونے والے مظالم کے ردعمل میں قتل وغارت اور دہشت گردی میں ملوث ہے بلکہ خود امریکہ اور مغرب نے اس میں اپنے آدمی داخل کر رکھے ہیں جو نہ صرف دہشت گردی کی کاروائیاں کرتے ہیں بلکہ دنیا کو اس کے تفصیلی ثبوت بھی فراہم کرتے ہیں اور یوں امریکہ 'خلافت' کے ادارے کے خلاف پروپیگنڈا کرنے اور اس کو بدنام کرنے میں کامیاب ہے اور سارے مسلمان امریکی پروپیگنڈے اور دباؤ کی وجہ سے اس 'خلافت' کی مذمت کرتے ہیں اور امریکہ کے ساتھ مل کر اسے ختم کرنے میں کوشاں ہیں۔سعودی عرب دہشت گردی کے خلاف جنگ [یہ دراصل فراڈ امریکی نعرہ ہے جو وہ مسلم ممالک کو تباہ کرنے کے لیے لگاتا ہے] کے لیے ۳۹ مسلم ممالک کی فوج اکٹھی کر رہا ہے حالانکہ وہ خود آزاد نہیں ہے اور امریکی فوج اس کے تیل کے کنوؤں پر قبضہ کر کے بیٹھی ہوئی ہے اور معاشی طور پر اسے نچوڑ رہی ہے۔(OIC بھی اسی وجہ سے معطل اور غیر فعال ہے)۔اس سے ظاہر ہے کہ سعودی حکمران دہشت گردی کے خلاف ۳۹ مسلم ممالک کا یہ اتحاد بھی دراصل امریکہ کے کہنے پر اور اس کے مفادات کے تحفظ کے لیے بنا رہا ہے۔

اہل مغرب کا دوسرا عزم یہ ہے کہ کسی اسلامی ملک میں شریعت نافذ نہیں ہونے دینی۔اور جہاں عوامی دباؤ شدید ہو وہاں اسے کاغذی کاروائی تک محدود رکھنا ہے جیسا کہ مثلاً پاکستان میں ہے کہ آئین وقانون میں بہت سی دفعات اسلامی ہیں لیکن ان پر ریاست کا کوئی ادارہ (انتظامیہ،

عدلیہ، بیوروکریسی، فوج، پولیس) عمل کرنے پر تیار نہیں۔ اور اگر افغانستان کے ملا عمر جیسا کوئی سرپھر نفاذ شریعت پر تُل جائے تو جبر اور قوت قاہرہ سے اس کی حکومت ختم کر دی جاتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی اہل مغرب نے پروپیگنڈے کے زور پر اپنے سیاسی نظام 'جمہوریت' کو مقدس بنا کر پیش کیا ہے اور اسے ایک ''عقیدہ'' بنا دیا ہے کہ دنیا کا کوئی آدمی اس کی مخالفت نہیں کر سکتا اور جو کرے وہ نکو بنے اور احمق و پاگل کہلوائے۔ خود پاکستان میں یہی حالت ہے۔ حالانکہ مغربی جمہوریت آسمان سے نہیں اتری۔ یہ مغرب کی لادین بلکہ دین دشمن آئیڈیالوجی اور اس کے ورلڈ ویو اور اس کے فلسفۂ علم کی پیداوار ہے اور خلافِ اسلام ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے ناقابل قبول ہے۔ جس معاشرے میں مغربی جمہوریت نافذ ہو، (خواہ معمولی تبدیلیوں سے اسے ''اسلامی جمہوریت'' کا نام دیا جائے) وہاں اس کے نتیجے میں لازماً مغربی تہذیب کا غلبہ ہو جاتا ہے اور اس کی اقدار غالب آ جاتی ہیں جیسا کہ پاکستان میں ہوا ہے کہ اس ''اسلامی جمہوریت'' کے نتیجے میں یہاں اسلام نہیں آیا [اور نہیں آ سکتا] بلکہ اسلام کے راستے بند ہو گئے ہیں اور شریعتِ نافذ ہونے کی بجائے مغربی تہذیب کے اصول و اقدار یہاں غالب آ گئے ہیں۔

اس جمہوریت میں اگر کچھ اسلامی اصول داخل بھی کر دیے جائیں تو بھی مندرجہ بالا نتیجے میں کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ مغربی جمہوریت اسلامی بن ہی نہیں سکتی اور نہ اسے اسلامی بنایا جا سکتا ہے۔ بھلا جس تصور کی بنیادیں ہیومنزم، سیکولرزم اور لبرلزم جیسے غیر اسلامی نظریات پر رکھی گئی ہوں وہ اسلامی کیسے ہو سکتا ہے اور اسے اسلامی کیسے بنایا جا سکتا ہے؟

خلاصہ یہ کہ مغربی جمہوریت اسلام مخالف نظریات کی پیداوار ہے اور اس میں کچھ اسلامی اصول ملا دینے سے وہ ''اسلامی جمہوریت'' نہیں بن جاتی اور نہیں بن سکتی اور نہ اس کے نفاذ سے ملک میں شریعت نافذ ہو سکتی ہے بلکہ اس کے نتیجے میں بھی مغربی تہذیب ہی غالب آتی ہے، اسلام نافذ نہیں ہوتا اور نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا مغربی جمہوریت لانا اگر ہمارے نزدیک قابل رد ہے تو اس کا اسلامی ورژن 'اسلامی جمہوریت' بھی ہمارے لیے ناقابل قبول ہونی چاہیے کیونکہ اس کا نتیجہ بھی دین دشمن مغربی تہذیب کا غلبہ ہے نہ کہ نفاذ شریعت جیسا کہ پاکستان میں ہم سب کا مشاہدہ اور تجربہ ہے۔

پس چہ باید کرد

سوال یہ ہے کہ اس صورت حال کا حل کیا ہے؟

اس صورت حال کا حل یہی ہے کہ مسلمان علماء، سکالرز اور مجتہدین، اسلامی تعلیمات کی بالادستی پر یقین رکھنے والے ماہرین دستور وقوانین کی مشاورت سے اسلام کا ایک سیاسی نظام تشکیل دیں جو عصر حاضر کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرتا ہو اور مسلمان حکمران اسے خلوص نیت سے اپنے اپنے ملک میں نافذ کردیں اور سارے مسلمان ممالک متحد ہو کر ایک امت بن جائیں جیسا کہ قرآن وسنت اور عقل کا تقاضا ہے۔

کیا ہم اندھے ہیں اور ہمیں نظر نہیں آتا کہ یہودی اور عیسائی اکٹھے ہو گئے ہیں۔ امریکہ ویورپی ممالک (ناٹو میں) اکٹھے ہیں۔ یورپی ممالک نے مل کر ''یورپی یونین'' بنالی ہے لیکن مسلمان ملکوں کو وہ اکٹھے نہیں ہونے دیتے بلکہ مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لیے ہی انہوں نے اپنے ایجنٹ مصطفیٰ کمال (اتاترک) کے ذریعے خلافت ختم کرائی تھی اور مسلمانوں کو چھوٹے چھوٹے ممالک میں تقسیم کردیا تھا۔ (مثلاً جو ملک اسلامی دور میں شام کہلاتا تھا وہاں انہوں نے پانچ ممالک قائم کردیئے اردن، شام، عراق، فلسطین اور لبنان) اور اب ان کو توڑ کر وہ انہیں مزید ٹکڑوں میں بانٹنا چاہتا ہے۔ چنانچہ پاکستان میں اپنے ایجنٹوں کے ذریعے وہ آزاد پختونستان بنانا چاہتا ہے، سندھ اور خصوصاً کراچی کو پاکستان سے الگ کرنا چاہتا ہے اور اسی طرح بلوچستان کو بھی آزاد ملک بنانا چاہتا ہے۔ اس کے لیے اس نے بھارت اور افغانستان کو ساتھ ملا کر اور بعض مقامی عناصر کو خرید کر اور انہیں اسلحہ، پیسہ اور تربیت دے کر اس نے ریاست پاکستان کے خلاف باقاعدہ جنگ چھیڑ رکھی ہے اور یہ سارے واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہے ہیں اور ہم ان کے عینی شاہد ہیں۔

ہم نے جو حل پیش کیا ہے وہ ایک آئیڈیل ہے، اسے زمینی حقائق پر کیسے منطبق کیا جائے؟ زمینی حقائق یہ ہیں کہ ہمارے حکمران صحیح اسلامی سیاسی نظام چاہتے ہی نہیں۔ اگر کسی طرح وہ تیار ہو بھی جائے تو وہ اس پر عمل نہیں کریں گے لہٰذا اس کے لیے انقلاب امامت یا تبدیلیٔ قیادت ناگزیر ہے اور وہ عوامی دباؤ اور سیاسی قوت ہی سے آسکتی ہے۔ اور عوامی دباؤ اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب عوام دینی قوتوں کا ساتھ دیں اور وہ ان کے ہم خیال ہوں۔ انہیں ہم خیال اور اسلام کا طالب اور اس پر عامل بنانے کے لیے ذہن سازی اور انسان سازی (قرآنی اصطلاح میں تعلیم کتاب وحکمت وتزکیہ) کے سارے ذرائع خصوصاً تعلیم اور میڈیا کو استعمال کرنا ہوگا۔ لیکن ہماری

دینی قوتیں اس طرح کی جدوجہد سے غافل رہی ہیں اور آج بھی ہیں۔

اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اسلامی ذہن کے جو لوگ سیاسی تبدیلی کے لیے کام کر رہے ہیں وہ متحد ہوں۔ انہیں متحد ہو کر تبدیلئ قیادت اور تبدیلئ نظام کے لیے عوامی حمایت سے جدوجہد کرنا ہوگی لیکن ہماری بدقسمتی سے حقائق یہ ہیں کہ ہماری دینی سیاسی جماعتیں اپنے اپنے فقہی وکلامی مسلک پر بنی ہیں اور انہیں دین سے زیادہ اپنا مسلک عزیز ہے۔ وہ اس فراست ہی سے محروم ہیں کہ کامیابی کے لیے اتحاد ضروری ہے لہٰذا وہ متحد ہونے کو تیار نہیں اور نتیجتاً ناکام ہیں۔ اور یہ پیشین گوئی کرنے کے لیے علم نجوم جاننے کی ضرورت نہیں کہ اگر پاکستان کی دینی قوتیں دعوت واصلاح، تعلیم وتزکیہ اور میڈیا کے ذریعے ذہن سازی اور انسان سازی کا کام نہیں کرتیں اور متحد نہیں ہوتیں تو وہ آئندہ بھی ناکام ہی رہیں گی۔

ہاں! عصر حاضر میں اسلام کے سیاسی نظام پر علمی کام ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے علوم اسلامیہ اور شعبہ سیاسیات کو مل کر کام کرنا چاہیے اور اس کے لیے خصوصی تحقیقی مراکز بننے چاہئیں۔ ظاہر ہے اس کام کے لیے افرادی اور مالی وسائل درکار ہیں۔ انفرادی سطح پر بھی بلاشبہ کچھ کام ہوسکتا ہے اور کئی لوگوں نے کیا بھی ہے (اس کی ایک مثال وہ انتخابی طریق کار ہے جو نظامِ خلافت کے علمبردار چوہدری رحمت علی صاحب نے پیش کیا ہے اور ہم نے اسے البرہان میں طبع بھی کیا تھا۔ دیکھیے شمارہ نومبر ۲۰۱۴ء)۔ تاہم ہماری رائے میں اس کے لیے اجتماعی اجتہاد درکار ہے بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ اس پر اجماع ہو یعنی ہمیں صرف اجتہاد ہی نہیں اجماع درکار ہے۔ اب اس کے لیے کون سوچے؟ بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ اجتماعی نظم کی اسلامی تناظر میں تشکیل نو کا کام صرف سیاسی نظام تک محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ سارے سماجی وعمرانی علوم مثلاً معاشیات نفسیات، تاریخ، تعلیم، قانون، فلسفہ، سوشیالوجی سب شعبوں میں یہ کام ہونا چاہیے بلکہ ہوسکے تو اس کے لیے ایک مکمل دائرۃ المعارف (یعنی انسائیکلوپیڈیا) الگ سے بنایا جانا چاہیے بلکہ پوری یونیورسٹی الگ سے قائم کرنی چاہیے۔ تاہم یہ کام کون کرے گا؟ اس کے تو خواب ہی دیکھے جاسکتے ہیں اور ہم یہ خواب پچھلے تیس سال سے دیکھ رہے ہیں اور قوم کو بھی دکھا رہے ہیں لیکن ہر طرف عجیب بے حسی کا عالم ہے اور اس خواب کے حقیقت میں بدلنے کے آثار کہیں نظر نہیں آتے۔

دینی مدارس کو اگر اللہ تعالیٰ توفیق دیں تو وہ بھی یہ کام کر سکتے ہیں لیکن وہاں ابھی تک اس کا کوئی تصور ہی نہیں کہ عمرانی علوم کا اسلامی تناظر میں مطالعہ کیا جائے۔ چند بڑے مدارس میں تخصص کا انتظام ہے اور وہ بھی فقہ وافتاء وغیرہ تک محدود ہے۔ حالانکہ مولانا حسین احمد مدنی نے ۱۹۳۳ء میں غلام ہندوستان میں یہ تجویز دی تھی کہ درس نظامی کی تکمیل کے بعد مدارس میں قرآن وسنت کے علاوہ لسانیات، عمرانیات بلکہ سائنسی مضامین میں بھی دینی مدارس کو تخصص کرانا چاہیے (ہم نے نصاب مدنی، کے نام سے مولانا کا تیار کردہ نصابی خاکہ مع تشریحات شائع کر دیا ہے) بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ خود درس نظامی میں معمولی تبدیلی سے اسلامی علوم کے ساتھ عمرانی علوم کے ماہرین تیار کیے جاسکتے ہیں اور کیے جانے چاہئیں۔ ہم اس کی اسکیم کئی بار البرہان میں پیش کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر محمود غازی مرحوم نے اپنے دور وزارت میں کچھ ماڈل مدارس قائم کیے تھے جن میں اسلامی علوم کے ماہرین کے ساتھ آخری مرحلے میں اسلامی تناظر میں عمرانی علوم کے ماہرین تیار کرنے کا پروگرام بھی شامل تھا لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ اور جیسا کہ ہمارے ملک میں ہوتا آیا ہے کہ ان کے وزارت چھوڑنے کے بعد وہ مدارس معطل پڑے ہیں اور ان میں وہ کام نہیں ہو رہا جس کے لیے وہ بنائے گئے تھے۔

جیسا کہ ہم نے کہا کہ اسلام کے سیاسی نظام کی تشکیل نو کے حوالے سے یورپ، عالم عرب اور خود ہمارے ہاں انفرادی سطح پر کچھ کام ہوا ہے لیکن اگر مستفسر اسی پر بضد ہیں کہ ”جو بولے وہی دروازہ کھولے“ کے مصداق راقم خود یہ کام کرے تو عرض ہے کہ میں بھی انسان ہوں اور میرے پاس بھی وقت اور صلاحیتیں محدود ہیں۔ اس کے باوجود میں نے چند سال پیشتر ”عصر حاضر اور اسلام کا سیاسی نظام“ کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کرنا شروع کی۔ پچاس ساٹھ صفحے قلم برداشتہ لکھے بھی لیکن جمع مواد اور مطالعہ وتحقیق کے لیے جتنا وقت اور یک سوئی درکار تھی وہ میسر نہ آئی اور وہ کام وہیں رُک گیا اور رُکا پڑا ہے۔ اور کثرت اشغال اور دوسری ترجیحات کے پیش نظر اس پر کام دوبارہ شروع کرنے کے امکانات بھی نظر نہیں آتے۔ ہاں! یہ ہوسکتا ہے کہ کبھی بوقت فرصت ان شاء اللہ عصر حاضر میں اسلام کے سیاسی نظام کی اسلامی تشکیل نو کے حوالے سے ایک عمومی خاکہ اور اس کے اہم نکات مَیں مرتب کر دوں۔ اللہ کرے ان سطور سے صاحب استفسار کی کچھ تشفی ہوگئی ہو۔

اسلام اور مغرب

معراج محمد*

مغرب کا ایجاد کردہ نیا مذہب - مذہبِ انسانیت

ڈاکٹر طاہر مسعود صاحب کی خدمت میں

[۲۷ جنوری تا ۲ فروری ۲۰۱۷ء کے (روزنامہ جسارت کراچی) کے فرائیڈے اسپیشل میں ڈاکٹر طاہر مسعود صاحب کے بعض معروف سیکولر حضرات کی مدح کرنے پر دینی حلقوں کی تنقید جاری ہے۔ ہمیں کراچی سے بزرگ اسلامی دانشور جناب ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کی ایک مختصر تحریر موصول ہوئی ہے جس میں ڈاکٹر طاہر مسعود صاحب کے رویے کو ''شرمناک'' قرار دیا گیا ہے۔ البتہ ہم ڈاکٹر طاہر مسعود صاحب سے متفق ہیں کہ ہمارے ہاں کے اسلامسٹ اکثر اپنے ہم خیالوں سے ہی محوکلام رہتے ہیں اور اختلاف کرنے والوں سے مجادلہ حسنہ اور دلیل کی بنیاد پر ان سے مکالمہ نہیں کرتے۔ ان کی یہ بات بھی صحیح ہے کہ بحیثیت انسان سب کی تکریم ہونی چاہیے خواہ کوئی غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو.... تاہم ان کی بعض باتیں ان حدود سے تجاوز کرتی نظر آتی ہیں اور ان سے مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب اور اس کے ہیومنزم اور لبرل ازم سے متاثر ہونے کا تاثر ابھرتا ہے لہٰذا ہم ان سے اختلافِ رائے رکھنے والوں کا نقطۂ نظر بھی اپنے قارئین کے سامنے رکھ رہے ہیں۔ مدیر]

فرائیڈے اسپیشل میں ڈاکٹر طاہر مسعود صاحب کی سید جعفر احمد صاحب کے حوالے سے تعریفی تحریر شائع ہو چکی ہے جس کی ابتداء ڈاکٹر صاحب نے اس طرح کی ہے ''اسے کوئی خوبی سمجھے یا خرابی، لیکن اپنی عادت اور مزاج کچھ ایسا ہے کہ وہ انسانوں کو عقیدے، نظریات، اور خیالات کی بنیاد پر قبول یا رد نہیں کرتا.... اپنے ہم خیالوں سے گفتگو کرنا گویا اپنے آپ سے مخاطب ہونا ہے.... لیکن اس سے جو یہ کہے کہ نہیں جناب آپ سے مجھے اختلاف ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ اس کے اختلاف فکر کو سنوں، کیا خبر ٹھیک ہی کہہ رہا ہو۔ (ص ۳۶)

* Mirajm289@gmail.com

ویسے یہ بات کہ ``ÝXĈFnL 'ŨŇn" # ŏŕŹ i øĒOŁHD ýXĈM "FŀĪY ōŁH یحتمل الصواب'' میرا راستہ ٹھیک ہے مگر غلطی کا احتمال رکھتا ہے اور دوسرے کا راستہ غلط ہے اور درست ہونے کا احتمال رکھتا ہے'' ہماری دینی روایت میں معروف ہے لیکن اس کا دائرہ بنیادی اصول وقواعد میں اتفاق کے بعد فروعی اختلافات ہیں۔خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس فروعی اختلاف والے اصول کو حق و باطل کے درمیان معاملہ پر منطبق کیا جائے۔

سیکولرزم ،لبرلزم اور اسلام کے درمیان اختلاف کوئی جزوی اور فروعی نہیں حق و باطل کا اختلاف ہے اور حق پر قائم ہونے کے بعد باطل کے ٹھیک اور حق ہونے کی توقع رکھنا اپنے قیام حق پر اضطراب کا اظہار ہے۔جس کی ڈاکٹر صاحب ہمیں ترغیب دیتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اپنے اور سید جعفر احمد صاحب کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''موصوف (ڈاکٹر سید جعفر احمد) تہذیب مغرب کا مشاہدہ اور ان کی معتبر ترین یونیورسٹی کی اعلیٰ ترین سند لے کر کیا لوٹے یہ خاکسار (ڈاکٹر طاہر مسعود) الٹے قدموں چلتے چلتے ماضی کی جنت گم گشتہ میں کھو گیا۔ وہ حلیہ جسے آج کل انتہا پسندی اور فنڈامنٹلزم (fundamentalism) وغیرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کو اپنانے کے بعد خاکسار دوستوں اور دشمنوں، اپنوں اور بیگانوں میں موضوعِ گفتگو بن گیا'' (ص ۳۶)

اپنے اسی زمانے کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''اس سے آگے سنیے ہم جوش مسلمانی میں ان ہی دنوں اتنے جذباتی ہو گئے کہ ایک دن وائس چانسلر کے پاس یہ سناونی دینے پہنچ گئے کہ حضور مخلوط تعلیم میں پڑھانا ہمارے لئے اب ممکن نہیں رہا۔ ہو سکے تو ہمیں اس پریشانی سے نجات دلایئے'' (صفحہ ۳۷) اس صفحے پر وہ اس جوش مسلمانی والی کیفیت سے سے نکلنے اور حالتِ اعتدال پر آنے کا بھی ذکر کرتے ہیں۔''عجیب سی بات، عجب ہی ادا کہ چڑھا ہوا دریا اترا اور کیفیتِ اعتدال میں لوٹا''۔اپنی اس کیفیت پر ڈاکٹر صاحب کا اپنا تبصرہ یہ ہے''یہ خاکسار (ڈاکٹر طاہر مسعود) الٹے قدموں چلتے چلتے ماضی کی جنت گم گشتہ میں کھو گیا''۔کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار۔

ڈاکٹر صاحب اپنے سیکولر دوستوں ڈاکٹر جعفر احمد صاحب اور ڈاکٹر توصیف احمد خان صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں'' یہ دونوں حضرات مخصوص خیالات ،نظریات رکھنے کے باوجود انسانی تعلق، انسانی رشتے کو کبھی نظریات وافکار کے تابع نہیں کرتے'' اپنی رائے دیتے ہوئے

فرماتے ہیں''اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے۔ہم کیوں نہیں سوچتے کہ سارے انسانی تصورات ونظریات انسانوں کی بہتری، ان ہی کی اصلاح اور ان ہی کی فلاح و بہبود کے لئے ہیں''۔(صفحہ ۳۷)

یہاں کیا تعلیم دے رہے ہیں ڈاکٹر طاہر مسعود صاحب؟ یعنی سیکولرازم، لبرل ازم، روشن خیالی، بدھ مت، ہندومت، مسیحیت اور تمام جاہلی نظریات وعقائد ایسے ہی انسانوں کی بھلائی، فلاح و بہبود کے لئے ہیں جیسے اسلام۔ پھر کیوں خوامخواہ انسانوں کو عقائد کی بنیاد پر تقسیم کیا جائے؟ آگے مزید وضاحت کرتے ہیں''اور کوئی مکتبہ فکر (گویا لبرل ازم اور سیکولرازم بھی اسلام کے اندر ایک مکتبۂ فکر ہی ہے) کتنا ہی اعلی وارفع کیوں نہ ہو وہ بلند ہوکر بھی انسان سے، اس کی ہستی سے، یہاں تک کہ اس کی کمزوریوں اور لغزشوں سے بھی بلند نہیں ہوسکتا۔ انسان کی عظمت اور اس کی بلندی کے گیت ایسے معاشرے میں الاپنا جہاں انسانوں کی تذلیل وتوہین عام ہو، بے وقت کی راگنی سی معلوم ہوتی ہے۔لیکن کوئی مانے نہ مانے، ہمارے دکھوں اور اذیتوں کی نجات انسانی احترام اور انسانی وقار وعزت کو تسلیم کرنے اور اس کی پاسداری کرنے ہی میں مضمر ہے''۔(صفحہ ۳۷)۔رہا مذہب اور حق و باطل کی بحث میں پڑنا تو یہ تو بس مولویوں اور فنڈامنٹلسٹوں کے دھندے ہیں۔اصل کام تو پُرامن بقائے باہمی، خوب سے خوب تر کی تلاش اور ہر چڑھتے سورج کی پوجا ہی ہے۔

ڈاکٹر طاہر مسعود صاحب فرماتے ہیں''جب کبھی میں ڈاکٹر (سید جعفر) صاحب سے اپنی دوستی اور قربت کے حوالے سے سوچتا ہوں تو یہی قدرِ مشترک ان میں اور خود میں پاتا ہوں کہ اختلافِ فکر انقطاعِ تعلق کا سبب نہیں بننا چاہیے''(صفحہ ۳۷) یہاں پہنچ کر ہمیں ایک اور اشکال ہوا کہ جب ڈاکٹر طاہر مسعود صاحب کو ڈاکٹر سید جعفر صاحب سے اتنا اتفاق ہے تو مضمون کے شروع میں یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ میرا جی چاہتا ہے کہ اختلافِ فکر والوں سے بات کروں۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں''ہر انسان محترم ہے کہ اس میں اللہ کی پھونکی ہوئی روح موجود ہے''۔ پھر تو باطل، شرک اور تمام برائیاں بھی محترم ہیں کہ اللہ ہی نے تو پیدا کی ہیں، کیا محض اللہ تعالیٰ کا پیدا کرنا محترم ہونے اور عند اللہ مرضیٰ (پسندیدہ) ہونے کے لئے کافی ہے؟ اب ڈاکٹر صاحب کو کون سمجھائے کہ بقولِ شاہنواز فاروقی صاحب''ایسی انسانیت جو ایمان اور کفر یعنی حق و باطل کے فرق کو نہ پہچانے جعلی انسانیت ہے۔''ڈاکٹر صاحب معروف سیکولر مؤرخ ڈاکٹر مبارک علی کے بارے میں فرماتے ہیں''ڈاکٹر مبارک علی کے خیالات سے مجھے بھی اختلاف رہا ہے، اب بھی

ہےلیکن ان کی عزت بھی میرے دل میں اسی لیے ہے کہ ایک علم اور کتاب بیزار معاشرے میں اگر ایک شخص نے اپنی ساری زندگی کتاب پڑھنے اور کتابیں لکھنے میں گزاری ہےتو وہ ہماری توجہ، التفات اور احترام کا مستحق ہے۔ خیالات کا اور افکار وتصورات کا اختلاف اپنی جگہ لیکن عالم کا احترام علم کا احترام ہے'' آگے لکھا ہے''پس علم کی عظمت کا اعتراف عالم کی تعظیم میں مضمر ہے''۔(صفحہ ۳۸) تو کیا ڈاکٹر صاحب کے مذکورہ اصول کی رو سے فاسق کا احترام فسق کا احترام نہیں اور سیکولرزم اور لبرل ازم کی عظمت کا اعتراف سیکولر اور لبرل کی تعظیم میں مضمر نہیں؟

ڈاکٹر طاہر مسعود صاحب نے سید جعفر احمد صاحب کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ ''ان (ڈاکٹر جعفر احمد) کے تجربے میں وہ اہل علم آئے جو غیر مذہبی مگر بہ حیثیت انسان نہایت عمدہ تھے، اسی مشاہدے نے انہیں اس نتیجہ پر پہنچایا کہ اخلاقی طور پر عمدہ اخلاق کا حامل ہونے کے لیے مذہبی ہونا ضروری تو نہیں''(صفحہ ۳۸) یعنی اصل چیز تو عمدہ اخلاق ہے۔ جب وہ مذہب کے بغیر اس کا حامل ہوسکتا ہےتو مذہب کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یہی وہ نعرے ہیں جنہیں ہم مختلف ذرائع سے مختلف حلقوں سے سنتے رہتے ہیں جن کا واحد مقصد یہ ہے کہ اسلام یعنی حق و باطل کو انسانوں کے درمیان امتیاز کا معیار ہونے سے نکالا جائے۔

یقیناً اللہ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے، اسے عقل سے نوازا ہے اور اس کی ہدایت اور رہنمائی کا مکمل انتظام کیا ہے۔ اس کے ایک فرد کے ناحق قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا کہ اگر اس (انسان) کی ہر برائی پر اس کی گرفت کی جاتی تو زمین پر کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی تخلیق بھی انسان کے واسطے فرمائی ہے۔ مگر جب یہ اپنے پروردگار کا ناشکرا بنتا ہے، حق سے روگردانی کرتا ہے، اللہ کی نافرمانی کر کے زمین میں فساد کا باعث بنتا ہےتو خود قرآن نے اسے أُولَئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ (الاعراف:۱۷۹) (وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے) قرار دیا ہے۔ انسان کی بہترین ساخت اور صورت کے بارے میں اللہ چار قسمیں کھا کر فرماتے ہیں لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ [التین:۴] (ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا) لیکن ان انسانوں کے درمیان تقسیم وتفریق بھی خود فرمائی ZnULZZ ZYUZZ ZY [[K Ayȩ¾ ș¾ na,7j [التین:۵] ہاں اگر وہ ایمان لائے اور عمل صالح کرے تو بڑا اجر ہے۔ ذیل کی آیتیں بھی ملاحظہ ہوں:

❁ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ اَمْ

نَجۡعَلُ الۡمُتَّقِیۡنَ کَالۡفُجَّارِ ﴿۲۸﴾ [ص ۳۸:۲۸]

''کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لاتے اور نیک اعمال کرتے ہیں اور ان کو جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں یکساں کر دیں؟ کیا متقیوں کو ہم فاجروں جیسا کر دیں۔''

❁ قُلۡ هَلۡ یَسۡتَوِی الۡاَعۡمٰی وَالۡبَصِیۡرُ ۙ اَمۡ هَلۡ تَسۡتَوِی الظُّلُمٰتُ وَالنُّوۡرُ ۚ [الرعد ۱۳:۱۶]

''کہو، کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہوا کرتا ہے؟ کیا روشنی اور تاریکیاں یکساں ہوتی ہیں''؟

❁ وَمَا یَسۡتَوِی الۡاَعۡمٰی وَالۡبَصِیۡرُ ﴿۱۹﴾ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوۡرُ ﴿۲۰﴾ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الۡحَرُوۡرُ ﴿۲۱﴾ وَمَا یَسۡتَوِی الۡاَحۡیَآءُ وَلَا الۡاَمۡوَاتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُسۡمِعُ مَنۡ یَّشَآءُ ۚ وَمَاۤ اَنۡتَ بِمُسۡمِعٍ مَّنۡ فِی الۡقُبُوۡرِ ﴿۲۲﴾ [فاطر ۳۵:۱۹تا۲۲]

''اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہے، نہ تاریکیاں اور روشنی یکساں ہیں، نہ ٹھنڈی چھاؤں اور دھوپ کی تپش ایک جیسی ہے اور نہ زندے اور مردے مساوی ہیں''۔

❁ اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ اجۡتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنۡ نَّجۡعَلَهُمۡ کَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحۡیَاهُمۡ وَمَمَاتُهُمۡ ؕ سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ ﴿۲۱﴾ [الجاثیہ ۴۵:۲۱]

''کیا وہ لوگ جنہوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم انہیں اور ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو ایک جیسا کر دیں گے کہ ان کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے! بہت برا حکم ہے جو یہ لوگ لگاتے ہیں''۔

❁ وَمَا یَسۡتَوِی الۡاَعۡمٰی وَالۡبَصِیۡرُ ۙ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الۡمُسِیۡٓءُ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَتَذَکَّرُوۡنَ ﴿۵۸﴾ [غافر ۴۰:۵۸]

اور یہ نہیں ہوسکتا کہ اندھا اور نابینا یکساں ہوجائے اور ایماندار و صالح اور بدکار برابر ٹھہریں۔ مگر تم لوگ کم ہی کچھ سمجھتے ہو۔

نافرمانوں سے علیحدگی کی اہمیت اتنی ہے کہ مسلمان روز سونے سے پہلے نمازِ وتر میں پڑھتے ہیں و نخلع و نترك من یفجرك ہم علیحدہ ہوجاتے ہیں اور چھوڑتے ہیں جو تیری نافرمانی کرے اور ان کے درمیان یہ رزم گاہ ہمیشہ سجی رہے گی۔

۞ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۡ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ
نَّارٍ ؕ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴿19﴾ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ﴿20﴾
[الحج ۲۲:۱۹،۲۰]

''یہ دوفریق ہیں جن کے درمیان اپنے رب کے معاملے میں جھگڑا ہے۔ان میں سے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیاان کے لیے آگ کے لباس کاٹے جا چکے ہیں، ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا''۔

اللہ ہمیں اس کشمکش میں حق کے ساتھ جُڑے رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنائیے۔

زرِاعانت سالانہ 400روپے تاحیات 5000روپے

نام.. پتہ..

فون..

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ A-97 نیلم بلاک،اقبال ٹاؤن،لاہور بھجوائیے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

تبصرۂ کتب　　　　مدیر

عبدالرشید ارشد - ایک مطالعہ

از حسین صحرائی (ٹنڈو محمد خاں، سندھ)

ہمارے عہد میں اسلامی تناظر میں برائی کے خلاف لکھنے اور یہود و ہنود و نصاریٰ کی اسلام، مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف سازشوں کی قلعی کھولنے والے کم ہیں اور ایسی جدوجہد کی پذیرائی اور حوصلہ افزائی کرنے والے تو تقریباً ناپید ہی ہیں۔ ایسے میں حسین صحرائی صاحب کا عبدالرشید ارشد صاحب پر قلم اٹھانا اور مذکورہ شعبوں میں ان کی تحریری جدوجہد کو نمایاں کرنا اور اس کی مدح کرنا ایک انتہائی عمدہ اور قابل تعریف کاوش ہے۔ مؤلف کو بھی ہدیہ تبریک اور برادرم ارشد صاحب کو بھی۔

۲۴۰ صفحات کی اس کتاب پر قیمت درج نہیں۔ کتاب حاصل کرنے کے لیے مؤلف سے (0333-2805008) پر رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

جناب غلام احمد پرویز کی فکر کا علمی جائزہ

از شکیل عثمانی، اسلام آباد

بزرگ دانشور شکیل عثمانی صاحب نے فکر پرویز کا جائزہ لینے کے لیے ممتاز اہل علم کے مضامین اس کتاب میں جمع کر دیے ہیں۔ جن علماء و سکالرز کے مضامین شامل کتاب کیے گئے ہیں ان میں سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا قمر احمد عثمانی، مولانا امین احسن اصلاحی، ماہر القادری، پروفیسر خورشید احمد، ڈاکٹر محمد دین قاسمی، خورشید احمد ندیم اور پروفیسر وارث میر شامل ہیں۔ خود ان کا اپنا ایک مضمون بھی آخر میں موجود ہے۔ یہ مجموعہ مقالات پرویز صاحب کی فکر اور کردار کو سمجھنے میں یقیناً بہت مفید ہے۔

بعض حساس لوگ کتاب کے آخر میں اغلاط نامہ شائع کر دیتے ہیں۔ مرتب موصوف نے کتاب کے شروع میں ایک ''صحت نامہ'' کا اضافہ کر دیا ہے۔ اتفاقاً ہماری نظر اس پر پڑ گئی کہ ''مولانا مودودیؒ'' غلط ہے اور ''مولانا مودودی'' صحیح ہے۔ ہم سمجھے شاید سہواً ایسا ہوا ہے لیکن چند سطریں بعد دیکھا کہ ''مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ'' غلط ہے اور ''مولانا ابوالاعلیٰ مودودی'' صحیح ہے۔

۱۷۶ صفحات کی یہ کتاب نشریات، لاہور نے شائع کی ہے اور لاہور میں کتاب سرائے (042-37320318) اور کراچی میں فضلی بک سپر مارکیٹ (021-32212991) سے مل سکتی ہے۔ اس پر قیمت درج نہیں۔